لد ۱۰۸ — دسمبر ۱۹۸۷ء — عدد ۳

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مؤسّس

مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۸ | دسمبر ۱۹۸۷ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ـــــــ ۴۲۴۴۶۸ ۳

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ریلوے کے ایک ڈویژن کا کسی ایک اسٹیشن پر خاتمہ ہوتا ہے اور وہاں سے نیا ڈویژن شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں عملہ تبدیل ہوتا ہے ـــــ بعض اوقات انجن بھی۔ بڑی تبدیلی ریلوے گارڈ کی تبدیلی ہوتی ہے۔ پیچھے سے کئی گھنٹے کی ڈیوٹی دے کر آنے والا گارڈ بڑی خوش و خرم حالت میں نئے آنے والے تازہ دم گارڈ کو سبز جھنڈیوں، بتی، سیٹی اور چابیوں کے علاوہ کاغذات کا چارج دیتا ہے اور سلام کہہ کر اس طرح باہر کو لپکتا ہے "جیسے کہ جان بچی اور لاکھوں پائے"۔

اور نئے گارڈ کے انتظام میں گاڑی اپنے مقررہ وقت پر، مقررہ راستے اور رخ پر اور اپنی مقررہ منزل کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔

نہ جانے والے گارڈ کو کوئی صدمہ کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا وہ سوچے کہ کسی کو جرأت کیوں ہوئی کہ مجھ سے چارج لے، میں اس سے سمجھوں گا۔

نہ آنے والے گارڈ میں کوئی شائبۂ فخر کہ بڑا مرتبۂ کمال ہاتھ آیا۔ نہ جانے والے سے اظہارِ افسوس کرنے والوں کا کوئی ہجوم، نہ آنے والے کے لیے تحسین و تبریک کے نعرے۔

نہ مسافروں میں کوئی ہل چل، نہ کسی طرح کا مظاہرہ، نہ کوئی جلوس، نہ اخباری بیان بازی، نہ تصویریں اٹھا اٹھا کر کسی کی حمایت اور نہ کسی کی مخالفت۔

مگر سیاست میں اس طرح ڈیوٹی بدلی (CHANGING GUARDS) نہیں ہوتی۔ حکومت کی وزارتیں ہوں یا انتظامی عہدے یا پارٹیوں کی لیڈرشپ یا انتخابات میں منصبِ نمائندگی

کا حصول - بڑی سازشیں ہوتی ہیں، جوڑ توڑ ہوتے ہیں - لپاڈگی تک بھی نوبت پہنچتی ہے — اخباروں کے صفحات عہدہ طلبوں کی خبروں سے بھر جاتے ہیں -

---

سیاست کے اس گندے کھیل کی مغربی روایات کو توڑ کر نیا در و بست اسلامی اصولوں پہ استوار کرنے کا تجربہ جماعتِ اسلامی نے شروع کیا - اور دوسرے مختلف پُر افادیت نظائر کے علاوہ جماعتی عہدوں کے انتخاب میں بھی ایسا طرز اختیار کیا کہ نہایت صاف ستھری، صحت مند، اور مثبت فضا پیدا ہو گئی -

حال میں مرکزی امارت کے انتخابات ہوئے۔ کوئی اُمیدوار نہ بنا، کسی نے پروپیگنڈہ نہ کیا، کوئی لٹریچر کسی کی حمایت و مخالفت میں شائع نہ ہوا، کوئی جھنڈے نہیں، تصویریں نہیں - مجلس شوریٰ نے اپنی مرضی سے تین نام ارکانِ جماعت کے سامنے رکھ دیئے کہ چاہیں تو ان میں سے کسی کو ووٹ دیں اور چاہیں تو کسی بھی دوسرے شخص کو ووٹ دے سکتے ہیں - اس انتخاب کے موقع پر چونکہ ہمارے بزرگ رہنما میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی صحت کی بنا پہ تمام ارکانِ جماعت کو خط لکھ کر ان سے درخواست کی تھی کہ مجھے معذور سمجھا جائے - اب میں امارت کی ذمہ داری کا حق ادا نہیں کر سکتا - لہٰذا ان کی صدق دلانہ اپیل کی وجہ سے ان کو ارکان نے "بارِ امانت" اُٹھانے پر مجبور نہیں کیا - اس طرح میاں صاحب نے ایک روشن مثال قائم کر دی کہ جماعت میں پُر زور حامیانہ فضا کے موجود ہوتے ہوئے انھوں نے "کرسی" کے ساتھ تادمِ آخر چمٹے رہنا پسند نہیں کیا - میرا خیال ہے کہ میاں صاحب کا یہ عالی ظرفانہ رویہ حکومت اور پارٹیوں کے عہدہ داروں کے لیے اپنے اندر مؤثر سبق رکھتا ہے۔

مجلسِ شوریٰ کے مقرر کردہ ناظم انتخاب (برائے امارت ۱۹۸۷ء) نے ضلعی نظاموں کی معرفت ہر رکن کو پرچہ رائے دہی بند لفافے میں پہنچا دیا - پھر ہر رکن نے مقررہ تاریخ تک اپنی رائے درج کر کے واپس پہنچا دی - ناظم انتخاب نے دو ارکانِ شوریٰ کی موجودگی میں ووٹوں کی گنتی کا اور مقررہ تاریخ تک نتیجے کا اعلان کر دیا - جماعت کے اکثریتی ووٹ قاضی حسین احمد صاحب

کے حق میں آئے اور وہ پانچ سال کے لیے جماعت کے امیر قرار پائے۔ حلف برداری کی تقریب ۶ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو منعقد ہوئی۔ اور نیا دورِ امارت باضابطہ طور پر شروع ہو گیا۔

آج جب کہ تحریکِ اسلامی کے گارڈ بدل گئے ہیں، گاڑی اپنے وقت پر اور اپنے راستے پر، طے شدہ منزل کی طرف ایسے جاری ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی تاریخی واقعہ پیش آیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ رحمت و سعادت اور خلفائے راشدین کے عہدِ خیر و برکت میں یہی صورت تھی۔ جو شخص موزوں تر ہوا، عوام نے اس کی بیعت کی اور دینی اصولوں کے مطابق سیاست و معیشت کا سارا نظام بخوبی چلتا رہا۔ کبھی کوئی مخالفانہ مظاہرہ نہیں ہوا، نہ کوئی جلوس نکلا، نہ واہیات نعرے گونجے، نہ کوئی کھسر پھسر ہوئی۔ یہی اسلامی جمہوریت کا منشا ہی یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً جزوی یا جامع تبدیلی کو تو آنا ہی ہوتا ہے۔ مگر وہ آئے تو پُرامن طریق سے آئے۔ رایوں اور دلائل کے بل پر آئے۔ مسکراتی فضا میں آئے، رواداری کی شان اور اتحاد و یگانگت کا رنگ لے کر آئے۔

جب تک مسلم معاشرہ سیاسی امن و اخوت کے قابل رہا اُسے یہ نعمت حاصل رہی۔ جب اہلیت ختم ہو گئی تو بادشاہت نے تخت بچھا لیے اور ظلم کے کوڑے حرکت میں آ گئے۔

ہم لوگوں کی تربیت قرآن و حدیث کے سایۂ مبارک میں ہوئی اور ہمارا ذوقِ اجتماعیت اس طرح کا بنا ہے کہ ہم ہر اس شخص کے ساتھ (بلا کسی نزاع کے) دلی تعاون کرتے ہیں جو دینی (اور دستوری) لحاظ سے جائز طور پر صاحبِ امر قرار پائے۔ کوئی سوال نسب کا، علاقے کا، مالی حیثیت کا اور دوسرے ظاہری مؤثرات کا نہیں ہے۔ اور ہم لوگوں کی تربیت یوں بھی ہوئی ہے کہ اپنے سابق امرا یا عہدہ داروں اور غیر عہدہ دار بزرگوں اور اہلِ علم اور اصحابِ خدمات و کردار کا ادب و احترام پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔

ہماری تربیت ایسی ہے کہ ہم اپنے امیر اور قائدین کے لیے بڑی محبت اور خیر خواہی

رکھتے ہیں لیکن نہ کسی عہدے کی پرستش کرتے ہیں اور نہ اپنا کوئی مفاد حاصل کرنے یا "نمبر بنانے" کے لیے ان کے گرد طواف کرنا اور خوشامدی ذہنیت سے کام لینا درست سمجھتے ہیں۔ بس جو رشتہ ہے وہ محبتِ خدا و رسولؐ اور قانونِ خدا و رسولؐ کے تحت ہے۔

حدیث کی رُو سے اسلامی نظامِ جماعت (و نظامِ معاشرہ) کے اہلِ امر کے معیار کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ: تُحِبُّوْنَهُمْ وَ يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَ يُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ (مسلم) یعنی تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کے لیے دعائے رحمت کرو اور وہ تمہارے لیے دعائے رحمت کریں۔

یہ ہے اسلامی جمہوریت کی طرف سے قیادت کا دیا ہوا معیار۔ اس کے برخلاف آج اربابِ قیادت چاہے پھولوں کی سیجوں پر بیٹھے ہوں، ان کے چاروں طرف بدگمانی، بدگوئی، سب و شتم اور بُرے بُرے چرچوں بلکہ مظاہروں تک کے نکیلے کانٹے بچھے رہتے ہیں۔ آج کل کا نظامِ قیادت پورے معاشرے کو نہ صرف سیاسی لحاظ سے بلکہ عام فضا کے لحاظ سے گندہ کر دیتا ہے۔

سچے مسلم معاشرے میں امارت کے معنی ایک بھاری بارِ امانت کو اُٹھانے کے ہیں جو خدا کی طرف سے بھی امانت اور اس کے بندوں کی طرف سے بھی امانت اور اس امانت کی آخرت میں سخت جواب دہی۔ کسی امیر یا صاحبِ منصب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے قرآن و حدیث سے فلاں مفہوم کس دلیل سے اخذ کیا اور لوگوں کو ایسا اور ایسا حکم کیوں دیا۔ کسی فرد پر کوئی جانی و مالی بار اگر اس کے احوال کے لحاظ سے زیادہ پڑا تو ایسا کیوں ہوا۔ لوگوں میں اگر اختلافات پھیلے، اگر ان کا اتحادِ فکر و نظر خراب ہوا۔ اگر ان کو صحیح جادۂ اقدام کے متعلق مغالطے لاحق ہو گئے یا وہ ڈھیلے پڑ گئے، جمود میں مبتلا ہوئے یا مایوسی کا شکار ہونے لگے تو ان سارے نقصانات میں تمہارے طرزِ عمل کا کیا حصہ ہے وھلم جرا۔

اسلامی تصورِ امارت و قیادت میں تقدس کے ساتھ جو ذمہ داری پائی جاتی ہے اس کا اندازہ دو مختصر احادیث کے اقتباسات سے کیجیے۔

ا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کسی منصب کی درخواست کی تو حضورؐ نے

فرمایا: اے ابوذر تم کمزور ہو، اور یہ مناصب (بھاری) امانت ہیں اور یہ قیامت کے دن سخت رسوائی اور پشیمانی کا باعث ہوں گے ـــ مستثنیٰ ہیں وہ لوگ جو مقررہ جائز طریق سے انہیں حاصل کریں۔ اور ان کے تحت جو ذمہ داریاں ان پر آتی ہیں اُن کو پوری طرح ادا کریں۔"

۲ ـــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا کہ تم لوگ حصولِ امارت و قیادت کی حرص کرو گے اور قیامت کے دن یہ تمہارے لیے ندامت کا باعث ہوں گے۔

ایسی ہی اسلامی امارت و قیادت کے لیے اطاعت فی المعروف کا بھی شدید حکم ہے۔

ان روایات پر نظر جاتی ہے تو آدمی لرز اٹھتا ہے کہ امارت و قیادت کے ثواب کے زیادہ ہونے کے ساتھ اس کا حساب کتاب کتنا سخت ہے مثلاً حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز اپنے خیمے میں داخل ہوئے تو خادم نے (جسے بعد میں انہوں نے آزاد کر دیا)، نے ان کے بشرے کو دیکھ کر کہا: "آپ شاید متردد ہیں"؟ بولے "یہ تشویشناک بات ہی ہے، مشرق و مغرب میں اُمتِ محمدیہ کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور بغیر مطالبہ و اطلاع اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو" [1]

پھر کام اس انہماک سے کیا کہ "ان کی مشغولیت کو دیکھ کر بعض لوگ ترس کھاتے تھے۔" [2]

اس موقع پر میں دَورِ جدید کے اس غیر اسلامی تصوّرِ قیادت کی تردید کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، جس کے لیے نوجوان قیادت کا ایک سلوگن ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اسلام نے شعور صرف صالح قیادت کا دیا ہے۔ اور اس میں اچھے جسمانی قویٰ کے ساتھ علمی برتری کو ضروری قرار دیا ہے۔ (وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ) واضح رہے کہ "علم" جس کا غالب پہلو علمِ حق اور علم ہدایت ہے، کو کفار کے خلاف مسلمانوں کے غلبے

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۲۲

[2] ایضاً ص ۱۵۰

کا ایک سبب بھی قرار دیا گیا ہے۔
اسی طرح خداوند تعالیٰ کی طرف سے کسی قوم یا انسانوں کو جو قیادت تفویض کی جاتی ہے اس کے لیے بھی معیار یہ ہے کہ فَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (القصص-۱۴) پھر جب وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے تکمیل کو پہنچ گیا اور توازن و اعتدال سے آراستہ ہوگیا۔ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (الاحقاف-۱۵) اس آیت میں اوسط زمانہ تکمیل کا خطِ ابتداء بھی معلوم ہوگیا۔ اور وہ ہے چالیس سال[1]۔ اس عمر میں قوتیں، عادات، ذوق، رجحانات ساری چیزیں ایک معیار کو پہنچ جاتی ہیں۔ پھر آگے دس بیس سال تک ان میں نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ یونس کی آیت ۱۶ کے یہ الفاظ بھی بڑے اہم ہیں۔ جو حضورؐ کی زبان سے مخالفینِ اسلام کے سامنے ادا ہوئے۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ یعنی مجھ پر اعتراض کرنے سے پہلے یہ سوچو کہ "میں تمہارے درمیان ایک دورِ عمر اس سے قبل گزار چکا ہوں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔"
مراد یہ ہے کہ امارت و قیادت کے لیے صرف ایسے لوگ موزوں ہوسکتے ہیں، جو کسی معاشرے میں ایک وسیع دورِ عمر گزار چکے ہوں اور اس دوران میں ان کے خیالات، ان کے جذبات، ان کے ذوق و شوق، ان کی تمنائیں، ان کے دوست احباب، ان کے مشاغل سب سامنے آچکے ہوں اور لوگ ان کے متعلق ایک ٹھوس رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔
مغربی تہذیب کا یہ دور چونکہ جدت طرازیوں کا زمانہ ہے۔ اس لیے نئے نئے شوشے پہلے دور پار سے اٹھتے ہیں۔ پھر وہ ہمارے معاشرے میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر وہ خود ہم جیسے محبانِ دین کو بھی پسند آنے لگتے ہیں۔ جن کا اپنا نظامِ معیار و اقدار ہے۔
دیکھ لیجیے، اس دور میں جہاں کہیں نوجوان قیادت کا تجربہ ہوا اور جہاں بھی معاملات

---

[1] یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص جو چالیس سال کی عمر گذار لے وہ قیادت کا اہل ہو جائے ــــــ دارومدار قوتوں اور صلاحیتوں کی معیاری نشو و نما اور ذہنی توازن و اعتدال پر ہے، جن کے ساتھ علم و حکم کی ذمہ داریاں چل سکتی ہیں۔ (ف۔ ر)

نوعمروں کے ملاحظہ آ ئے ہیں وہاں حالات ابتر ہو گئے ہیں ۔ مثلاً انڈیا کی نوجوان قیادت کا حالِ زار دیکھ لیجیے اور اس کے اثرات جو قوم پر پڑ رہے ہیں وہ بھی بغور ملاحظہ کیجیے ۔ فلپائن میں اکینو کے تجربے کو دیکھیے، اور اسی طرح تاریخِ ماضی و حال میں اور بھی نمونے زیرِ نظر لائیے ۔

یہ تو خدا کا شکر ہے کہ اسلام ذہنی تربیت ایسی کرتا ہے کہ مسلمان نوجوان کبھی خودسر نہیں ہوتے ، اپنے بزرگوں کے ظاہری ادب و احترام ہی کا خیال نہیں رکھتے ، ان کے علم و تجربہ کا بھی لحاظ کرتے ہیں ۔ اور بڑے ان کو جس چیز سے روکیں ، اس سے وہ رک جاتے ہیں اور جس چیز کے لیے وہ متوجہ کریں اُسے اختیار کر لیتے ہیں ۔ یہ ہے مسلمان نوجوانوں کی ساخت ۔ اس روش سے ہٹ کر جو نوجوان معاشرے کی یونیورسٹیوں اور اس کے اداروں میں پائے جاتے ہیں، وہ جہاں بھی ہوتے ہیں بھینسوں جیتنی موٹی انا اور اپنی ضد اور جدت طرازی اور بغاوت پسندی کی وجہ سے طرح طرح بگاڑ پیدا کر دیتے ہیں ۔

ہم پر اللہ کی مہربانی ہے کہ ہمارا جماعتی نظام امارت و قیادت کے انتخاب میں بہت اچھا نقطہ نظر رکھتا ہے ۔

سو جو تبدیلی ہمارے ہاں آئی ہے ، خدا اُسے ہمارے لیے مبارک کرے ، جماعت کا نظم مضبوط ہو ، تحریک کی دعوتی رَو تیز تر چلے اور اللہ کی رہنمائی و مدد نئے دَورِ قیادت و نظم پر سایہ افگن رہے ۔

میاں صاحب امارت کے منصب پر نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے بے حد محترم بزرگ اور جماعت کے اکابر کے لیے نہایت مخلص مشیر اور کارکنان کے لیے باعثِ تقویت ہیں ۔ خدا ان کو مزید صحت اور قوتِ کار دے ۔ آمین ۔

(ادارہ)

حکمتِ سید مودودیؒ

سُود و زیاں

بخاری میں ہے: تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ وَالْقَطِيفَةِ وَالْخَمِيصَةِ

ترجمہ: اشرفیوں اور روپوں والے، جھالردار لباس والے، سیاہ عبا والے سب گرے ہلاک ہوئے تم کہتے ہو، مفلس قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے، لیکن جس کی قوم ہے وہ فرماتا ہے کہ درہم و دینار کے بندے تباہ ہوئے۔ اب تمہی بتاؤ کہ ہم مسلمان کس کی سنیں!؟ اور سچ ہے کہ جس قوم میں افلاس کا رونا ہے، انہوں نے جب سُود کھایا اور خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ تیرہ تیرہ برس کے اندر بائیس بائیس روپیہ کو بائیس بائیس لاکھ روپیہ تک بنا کے رہے۔ ان کے افلاس کے مرثیہ خوانوں کی دُنیا میں کیا کمی ہے۔ کیا دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا اسی قوم کو نہیں پہنچ جاتا ہے، جو سُود کے میدان میں بازی مارے ہوئے ہے؟ فی کس تین پیسے کن قوموں کی آمدنی ہے؟ اور ان کو تو جانے دو، حکومت کے زور سے جو سُود کھا رہے ہیں ان کے مزدوروں کا حال کیا تمہاری نظر سے نہیں گذرتا۔ سچ فرمایا اُمت کے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم نے:

"لَوْ كَانَ لِابْنِ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَا بْتَغَى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ (وَفِي رِوَايَةٍ) عَيْنَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ" (بخاری)

ترجمہ: اگر آدم کے بچے کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی تلاش میں مصروف ہوگا اور آدم کے بچے کا پیٹ (یا آنکھ) مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

سر منزلِ قناعت نتواں زدست دادن
اے ساربان فروکش کیں رہ کراں ندارد

مسلمانوں کے لیے تو وہی نغمہ کافی ہے جو آج سے تیرہ (چودہ) سو برس پیشتر گایا گیا:
اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ ۔ (سود۔ ص ۳۸۱-۳۸۲)

قرآن حکیم اور عروج و زوال اُمم

جناب میر حسین صاحب ایم ۔ اے ۔ فاضل دیوبند

(۲)

کسی قوم میں روحِ عمل پھونکنے، اس کے خون کو گرمانے اور اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھرنے والا تیسرا بڑا عامل اس قوم کا نصب العین اور مقصدِ حیات ہے۔ یہ نصب العین حصولِ مسرت و آسائش بھی ہو سکتا ہے۔ اور اقتدار و استعلاء کا جذبہ بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں ہر مقصد انسان کو آمادۂ عمل بناتا ہے اور ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ وسائل دوسروں سے چھین کر اپنے قبضے میں لے آنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن جو سیمابی کیفیت کسی قوم میں اس کا نظریاتی مقصدِ حیات پیدا کرتا ہے وہ کسی دوسرے جذبہ سے ممکن نہیں۔ یہ نظریاتی مقصد اسے ایسا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے جسے کسی کل چین نہیں پڑتا۔ اس کی تبلیغ و تدویج کے لیے وہ قوم جدوجہد کرتی، کڑیاں جھیلتی اور راہ کی تمام صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہے —— نصب العین کی یہ آتشِ سوزاں اس میں وہ وسعتِ نگاہ پیدا کر دیتی ہے کہ اس کی نظریں اُفق پار پہ جا ٹھہرتی ہیں اور اسے وہ عزم اور حوصلہ بخشتی ہے کہ نہ صحراؤں کی وسعتیں اس کی پیش قدمی روک سکتی ہیں اور نہ کوہساروں کی رفعتیں۔ وہ آفاق پر لگاہیں جمائے سمندروں میں گھوڑے ڈال دیتی ہے اور کشتیوں کو جلا ڈالتی ہے کہ پسپائی کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ جدوجہد کی اسی زندگی کا خوگر رکھنے کے لیے حضرت عمرؓ نے اپنے امرا اور سپاہ پر کھُردرے رہن سہن کی پابندی لگا رکھی تھی اور تنعم و عیش سے منع فرمایا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے: اَلْجِهَادُ

مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ کہ جدوجہد کی ضرورت قیامت تک باقی رہے گی۔

لیکن اقتدار پالینے کے بعد وسائل معیشت پر تسلط ہو جانے کے بعد اس بات کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے کہ قوم تعیشات وتنعمات کی عادی بن کر اپنے مقصد حیات کو بتدریج پس پشت ڈال دے۔ جدوجہد اور جفاکشی کی زندگی سے دست کش ہو جائے۔ دولت کی محبت اسے بزدل اور موت کا خوف اسے بے غیرت بنا دے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو سمجھ لیجیے کہ نہ صرف اس کے اقتدار واستعلاء کے دن گنے جا چکے بلکہ بہت ممکن ہے کہ بتدریج وہ ذلت ومسکنت کے گڑھے میں جا گرے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا ۔ ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ کہ ذلت وبے چارگی ان کا مقدر بن گئی ۔ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کی ان تینوں کمزوریوں کا متعدد آیات میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ متاع دنیا سے اُن کی محبت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کی خاطر وہ کتاب الٰہی میں تحریف سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ قرآن مجید کہتا ہے: فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا (بقرہ) موت سے ان کے دل اس قدر لرزاں تھے کہ: یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ (البقرہ) موت کے اسی خوف کی وجہ سے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ فَاذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ) ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے مقصد بعثت کو پس پشت ڈال دیا۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ فَنَبَذُوْہُ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ وَاشْتَرَوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ۔ (آل عمران)

اقتدار و عروج حاصل ہو جانے کے بعد کوئی قوم کتنی دیر تک اس سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ اس کا انحصار اس نظام حکومت اور اس طرزِ معاشرت پر ہے جسے یہ قوم اپناتی ہے۔ یہ حقیقت اتنی واضح اور بدیہی ہے کہ اس پر کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے جب خدا کی مخلوق کو کسی قوم کے سایہ عاطفت میں امن وسکون اور عدل وانصاف میسر ہو گا تو جہاں

مخلوق کے خالق کی نصرت وحمایت اسے حاصل ہوگی وہاں خود وہ مخلوق بھی اس سایہ کو اپنے سروں پر دیر تک قائم رکھنے کی خواہش مند ہوگی اور اس کے لیے کوشاں بھی۔ حمص کے عیسائیوں نے اپنے ہم مذہبوں کے برخلاف مسلمانوں کی فتح وکامرانی کی اسی لیے دعا کی تھی کہ مسلمانوں کے نظامِ عدل وانصاف میں وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے جو انہیں اپنے ہم مذہبوں کے زیر اقتدار میسر نہ آسکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئی ابھرتی ہوئی امتِ مسلمہ کو بار بار عدل وانصاف کی تاکید کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ ۔۔۔۔ (النحل) دوسرے مقام پر حکم دیا کہ اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۔ پھر کسی عصبیت میں آکر عدل کا دامن چھوڑ دینے سے بھی روکا گیا بالفاظ دگر دشمن کے ساتھ بھی عدل وانصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ قرآن مجید کہتا ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا۔ خود پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ: فَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۔ (مائدہ - ۴۲)

عدل کا مفہوم صرف جھگڑوں اور تنازعات کو اصولِ انصاف کے مطابق طے کرنے تک محدود نہیں بلکہ یہ لفظ اپنے اندر ایک بڑا وسیع اور ہمہ گیر مفہوم رکھتا ہے جو معاشرت، معیشت، محاکمات، سیاست، حکومت اور انسان کے ساتھ انسان کے طرزِ عمل (اخلاق) کو محیط ہے۔ ان تمام شعبہ ہائے حیات میں عدل وانصاف پر مبنی نظام ہی عدل وانصاف کہلا سکتا ہے اور یہ خوبی صرف اسلامی نظامِ حیات ہی میں پائی جاتی ہے۔ ان دوائرِ زندگی میں سے کسی ایک میں بے اعتدالی کو ظلم وجور سے تعبیر کیا جائے گا۔

اگر کسی قوم کا معاشرہ عدل کی بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ اس میں رنگ، نسل، زبان، مذہب یا ذات پات کی بنیاد پر انسانوں میں اونچ نیچ قائم ہے۔ انسان انسان سے نفرت کرتا ہے۔ اسے اچھوت قرار دیتا ہے، اس کے جان ومال اور عزت وآبرو کو مباح ٹھہراتا ہے۔ اور اسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھتا ہے تو عدالتوں میں نام نہاد انصاف کے باوجود وہ قوم ظالم شمار ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی قوم کے نظامِ معیشت میں بے اعتدالی

پائی جاتی ہے۔ چند صنعت کار یا جاگیر دار ملک کی معیشت پر قابض ہیں اور قوم کی اکثریت نادار و مفلس اور اُن کی دستِ نگر ہے تو یقیناً یہ قوم بہ حیثیت مجموعی ظلم کی مرتکب ہو رہی ہے اور اگر کسی قوم کا عدالتی نظام بھی ایسا ہو کہ وہاں سے انصاف حاصل کرنے کے لیے پوری زندگی کی بازی لگانی پڑے یا ساری عمر کی کمائی اس میں کھپ جائے تو ظالمانہ نظام کی اس سے بدتر صورت اور کیا ہوگی۔ وہ معاشرہ بھی یقیناً ظلم و عدوان میں مبتلا ہے جس کے نظامِ اخلاق کی بنیاد انسان کے سفلی جذبات کے استحصال پر ہو اور جس کا مقصود و منتہائے صرف حصول لذت و مسرت ہو اور جہاں عریانی، بے حیائی، عصمت فروشی، ہم جنسیت، شراب نوشی منشیات کے استعمال جیسی فواحش و منکرات کی کھلی چھٹی ہو۔

ظلم و جور کی یہ ساری صورتیں ایسے عوامل ہیں جو کسی بھی مقتدر قوم کو دیمک کی طرح چاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ سے کہا تھا کہ پہلی قومیں اس لیے تباہ و برباد ہوئیں کہ ان میں عدل و انصاف نہ تھا۔ وہ جرائم کے ارتکاب پر نام نہاد معززین سے تو درگذر کرتے تھے، مگر بے بس و لاچار لوگوں کو تعذیب کے شکنجے میں کس دیا جاتا تھا۔

قرآن مجید کے مطالعے سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی ہلاکت و بربادی کا جہاں بھی ذکر کیا ہے، اس کی وجہ اس کا ظلم و عدوان، ان کی مجرمانہ زندگی اور ان کا فسق و فجور ہی بتائی ہے۔ سورۃ الحج میں فرمایا: فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ کہ ہم نے کتنی ہی بستیوں کو اس حالت میں ہلاک کیا کہ وہ ظالم تھیں۔ چنانچہ وہ بستیاں چھتوں کے بل اوندھی گری پڑی ہیں۔ کنوئیں بے کار اور مضبوط محلات برباد ہو چکے ہیں۔

اسی سورت میں دوسرے مقام پر فرمایا: وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ۔ کہ کتنی ہی بستیوں کو ان کے ظالم ہونے کے باوجود میں نے مہلت دی پھر (جب وہ نہ سنبھلے) تو انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

آخر سبھی کو میری طرف لوٹنا ہے۔ قوم تبع اور ان سے پہلی اقوام کے بارے میں کہا کہ:۔ اَھْلَکْنٰھُمْ ۔ اِنَّھُمْ کَانُوْا مُجْرِمِیْنَ کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ یقیناً وہ مجرم تھے۔

سورۂ کہف میں سنتِ الٰہی بتائی: فَھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ کہ فسق و فجور اور گناہ کی عادی قوم ہی کو برباد کیا جاتا ہے۔ آلِ فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کی بربادی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا: فَاَھْلَکْنٰھُمْ بِذُنُوْبِھِمْ کہ ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کیا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ کسی معاشرے کو ظالمانہ بنیادوں پہ استوار کرتے اور اس میں فواحش و منکرات کو رواج دینے والے ہمیشہ بقول قرآن مترفین یا بالفاظ دگر سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ اپنے سرمائے کے بل پر وہ لوگ ملک کے اندر ایسا نظامِ معیشت قائم کرتے ہیں جس سے زیادہ سے زیادہ وسائلِ دولت انھی کے ہاتھ میں رہیں۔ ملک کی بہت بڑی آبادی کو صرف قوتِ لایموت ہی میسر آسکے۔ ملک کی لاکھوں ایکڑ اراضی کے چند لوگ مالک بن کر مزارعین کا استحصال کرتے ہیں۔ پھر انھی وسائلِ دولت کو کام میں لا کر حکومت و اقتدار پر بھی قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح دولت اور طاقت دونوں انھی کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہیں۔ وسائلِ دولت پر قابض ہونے کی وجہ سے وہ عیاشانہ زندگی گزارتے ہیں اور اس کے لیے نئی نئی راہیں نکال کر انھیں معاشرے میں رواج دیتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی درمیانی اور نچلے طبقے کے لوگ بھی ناجائز طریقوں سے دولت کما کر انھی کی راہ پہ گامزن ہو جاتے ہیں اور یوں پورا معاشرہ گناہ آلود زندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فسق و فجور کے بازار کھل جاتے ہیں۔ مخلوط میل جول کے لیے کلب بن جاتے ہیں۔ آرٹ اور ادب سفلی جذبات کو آگ لگانے کے لیے فتیلے کا کام دینے لگتے ہیں۔ اس گندے کھیل کو جائز اور معقول قرار دینے کے لیے دانشوروں کا ایک طبقہ نئے نئے فلسفے تراش لیتا ہے اور یہ سارا کاروبار انھی مترفین کی تحریک، سرپرستی، حمایت اور خواہش پہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید اس حقیقت کی نشان دہی ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ کہ جب ہم نے کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہا تو اس کے سرمایہ داروں کو اپنے احکام کا مکلف بنایا جنہوں نے اس بستی میں فسق و فجور کو رواج دیا اور یوں اس بستی کے بارے میں ہمارا فیصلہ صحیح رہا تو ہم نے اُسے بُری طرح سے تباہ و برباد کر دیا۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں۔

(ادارہ)

ایک طالب علم کے چند سوالات ـــ وجودِ باری تعالیٰ

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

ایک روز ایک نوجوان طالب علم میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ میں آپ سے چند سوالات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میں نے کہا ناراضگی کی کیا بات ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوا تو جواب دے دوں گا، ورنہ خاموش ہو جاؤں گا۔

طالب علم: کیا خدا موجود ہے؟

میں: ہم جن چیزوں کو موجود مانتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کو ہم حواسِ خمسہ کی مدد سے دریافت کرتے ہیں۔ جیسے میز، شور و غل، خوشبو، ریشم۔ دوسری وہ جن کو ہم اپنی عقل کی مدد سے پہچانتے ہیں۔ جیسے دردِ سر، بلب روشن دیکھا تو جان لیا کہ بجلی ہے۔ انسان کو بات کرتے دیکھا تو جان لیا کہ زندگی ہے۔ حالانکہ نہ ہم نے درد دیکھا، نہ بجلی دیکھی، نہ رُوح دیکھی۔ خداوند تعالیٰ بھی دید سے بالا ہے۔ غیر مرئی (INVISIBLE) ہے۔ اس کو صرف عقل کی مدد سے ہم جان سکتے ہیں۔

بلکہ حواس سے دریافت شدہ اشیاء کو بھی عقل کی مدد سے زیادہ بہتر طریقہ سے جان سکتے ہیں۔ عقل حواس کی غلطیوں کی اصلاح کر دیتی ہے۔ آنکھ بتاتی ہے کہ سورج ایک طشتری کے برابر ہے، عقل کہتی ہے کہ سورج زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ اسٹیشن پر کھڑے ہو کر انسان کہتا ہے کہ ریل کی پٹریاں آگے جا کر مل جائیں گی۔ عقل بتاتی ہے یہ متوازی ہیں۔ یہ نہیں ملیں گی۔

طالب علم: پھر کیسے معلوم ہو کہ خدا موجود ہے یا نہیں؟

میں: جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عقلی وجود رکھنے والی اشیاء کو حواس کی مدد سے دریافت نہیں کر سکتے۔ ان کو ان کے نتائج اور اثرات کی مدد سے دریافت کرتے ہیں۔ پنکھا چل رہا ہے، ہم کہتے ہیں بجلی ہے۔ جب پنکھا بند ہو گیا، ہم کہتے ہیں بجلی چلی گئی۔ حالانکہ ہم نے نہ اُسے آتے دیکھا اور نہ جاتے دیکھا۔ ایٹم کو بڑی سے بڑی خورد بین کی مدد سے بھی دیکھا نہ جا سکا، مگر اس کے اثرات کا یہ حال ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جاپان میں جوہری بم نے دو لاکھ انسانوں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ کو بھی ہم آثار اور نشانیوں سے پہچانتے ہیں۔

طالب علم: وہ آثار اور نشانیاں کیا ہیں؟

میں: اگر کہیں موزونیت و مقصدیت، حکمت اور دانائی کی کوئی بات نظر آتی ہے تو ہم بول اُٹھتے ہیں کہ یہ کسی صاحبِ عقل ہستی کا کام ہے۔ اس کے پسِ پردہ کسی حکیم اور مدبر صانع کی کارفرمائی ہے۔ پتھر اگر راستہ میں پڑا ہوا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یونہی لڑھک کر یہاں آ گیا ہے، لیکن اگر پتھر دیوار میں موزوں انداز میں چنا ہوا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں اس کو کسی انسان نے موزوں کیا ہے۔ اس کی موزونیت انسانی ذہن کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہاں ہم یہ بات ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ پتھر خود بخود یہاں دیوار میں آ کر موزوں ہو گیا ہے۔

بالکل اسی طرح اگر مظاہرِ کائنات میں مقصدیت اور موزونیت، حکمت اور دانائی کے مظاہرات بکھرے نظر آتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ ان مظاہرات کے پس پردہ دانا اور حکیم ہستی کارفرما ہے۔ یہ ساری تخلیق ایک مدبر اور حکیم صناع کی ہے۔

طالب علم: وہ حکمت و دانائی کے آثار کہاں ہیں؟

میں: اربوں کھربوں سال سے سورج حد درجہ پابندیٔ وقت کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ موسم اپنے اوقات پر آتے ہیں۔ بارشیں اپنے وقت پر ہوتی ہیں۔ کیا یہ نظم کی پابندی جو لاکھوں اربوں سال سے چلی آ رہی ہے کسی حکیم اور مدبر صانع کی طرف اشارہ

نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ خود بخود ہو سکتا ہے؟ کیا اندھی بہری فطرت یہ کام کر سکتی ہے؟

جغرافیہ دان بتاتے ہیں کہ کرۂ ارضی کا قیام عمودی نہیں ہے، بلکہ یہ قدرے جھکا ہوا ہے۔ عمودی ہونے کی صورت میں زمین پر سردی گرمی ہمیشہ یکساں رہتی اور ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ پھر یہاں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا تھا، مگر اب اس جھکاؤ کی وجہ سے سردی گرمی میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ قابلِ برداشت ہے۔ گویا صانع حکیم کے تخلیق کے روزِ اول ہی میں یہ بات پیشِ نظر تھی کہ کرۂ ارضی کا طبعی موسم حیاتِ انسانی کو فروغ دینے کا سبب بنے۔ کیا یہ بات مدبر و حکیم صانع کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا ہے۔ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

انسان کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ایک گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے، نہ عقل، نہ سمجھ، نہ زبان۔ محبت بھری ماں اس کو اپنے سینہ سے چمٹاتی ہے۔ خاص اسی مقام پر اس کی غذا کے لیے دودھ کے دو چشمے جاری موجود ہیں۔ کسی دوسرے مقام پر، پیٹھ پر، ران پر، یا کمر پر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ بچہ سینہ پر منہ مارتا ہے، نہ کمر پر نہ ران پر۔ کیا یہ مقصدیت حکیم اور مدبر صانع کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ کام خود بخود ہو گیا؟ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

انسان کی آنکھ دیکھیے۔ آنکھ بہت نازک ہوتی ہے اس کی حفاظت مقصود ہے۔ آنکھ کے دروازے پر پہرے داروں کا دستہ پلکوں کی صورت میں مستقل کھڑا رہتا ہے۔ پھر بھی کسی طرح گرد و غبار آنکھ کے اندر داخل ہو جائے تو فوراً آنسوؤں کا سیلاب آکر آنکھ کو دھو کر صاف کر دیتا ہے۔ صفائی کا یہ خودکار نظام (SELF-FLUSHINS) کیا مقصدیت کی غمازی نہیں کر رہا ہے؟ کیا یہ کسی حکیم و مدبر صانع کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہے؟ کیا یہ خود بخود ہو گیا؟ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

انسان کا کان دیکھیے۔ اس کی بناوٹ پر غور کیجیے۔ کان کا مصرف آوازوں کو سننا ہے، آوازوں کی لہروں کو وصول کرنا ہے۔ لہریں خاص انداز میں دائرہ میں سفر کرتی ہیں۔ کان کی ساخت اسی مقصد کو سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے۔ کان میں اُبھار، نشیب و فراز رکھے

گئے ہیں - اگر یہ اُبھار نہ ہوتے اور کان سپاٹ ہوتے تو لہریں برابر سے گزر جاتیں اور آواز سنائی نہ دیتی - مزید غور کیجیے کہ یہ اُبھار گوشت اور کھالوں سے بنائے جاتے تو کمزوری اور بڑھاپے میں ڈھیلے پڑ جاتے - پھر وہ آواز کو پکڑ نہیں سکتے تھے - یہ اُبھار اگر ہڈی کے بنائے جاتے تو کھڑی ہڈی کی موجودگی میں انسان کروٹ لے کر سو نہیں سکتا تھا - اس لیے صانع نے ہڈی تو استعمال کی مگر کرکری ہڈی استعمال کی جس کی موجودگی میں انسان کروٹ لے کر سو سکتا ہے - کیا یہ سب اعلیٰ مقصدیت اور اعلیٰ حکمت کسی حکیم اور مدبر حکیم کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے ؟ کیا یہ خود بخود ہو گیا ؟ یہ کام کیا اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے ؟

ہر چیز جم کر بھاری ہو جاتی ہے ، اور بھاری چیز پانی میں نیچے جا کر بیٹھ جاتی ہے ، مگر پانی جم کر برف بن کر ہلکا بن جاتا ہے - بجائے نیچے بیٹھنے کے سطحِ آب پر تیرتا ہے - اگر وہ زیرِ آب بیٹھ جاتا تو سردی کے زمانہ میں تمام دریا اور سمندر جم جاتے - اور سمندروں میں موجود آبی مخلوقات جم جاتی اور مر جاتی - بحالاتِ موجودہ برف جم کر سطحِ آب پر آ جاتی ہے - سرد ہواؤں کو نیچے نفوذ کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے - اسی وجہ سے سردی کے موسم میں دریاؤں میں زیرِ آب پانی بہتا رہتا ہے - مچھلیاں اور دیگر آبی مخلوقات زندہ رہتی ہیں - یہ مقصدیت یہ حکمت کیا کسی حکیم و مدبر صانع اور خالق کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے ؟ کیا یہ خود بخود ہو گیا ہے ؟ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے ؟

قطب شمالی کے علاقے میں ہمیشہ برف پڑی رہتی ہے - وہاں کوئی سبزہ اور روئیدگی نہیں ہے وہاں بھی انسان آباد ہیں جن کو اسکیمو کہتے ہیں - سردیوں میں جب سارا خطہ برفستان بن جاتا ہے تب بھی ان کی خوراک کا انتظام موجود ہے - ان لوگوں کو اپنے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فلاں فلاں مقام پر دریا بہتا ہے - اگرچہ وہ اب برف سے ڈھکا ہوا ہے - وہاں وہ بارہ سنگے کی پسلی کی ہڈیوں سے بنے ہوئے نیزوں سے برف میں سوراخ کرتے ہیں - روشنی اندر نفوذ کرتی ہے - مچھلیاں روشنی کی طرف لپکتی ہیں - وہ آسانی سے ان مچھلیوں کا شکار کرتے رہتے ہیں - اِس طرح ان کو غذا ملتی رہتی ہے ، کیا ماحول میں اور انسانی ضروریات میں تطابق اور مقصدیت کسی حکیم و مدبر خالق کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے ؟ کیا یہ سب کچھ خود بخود

ہو گیا ہے ؟ کیا یہ اندھی بہری فطرت یہ کام کر سکتی ہے ؟

غرضیکہ جو شخص بھی ہٹ دھرمی کی عینک آنکھ سے اُتار کر کھلے دل سے اور کھلی آنکھ سے مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت پر نظر ڈالے گا اور غور کرے گا اس کو یقیناً ان مناظر اور مظاہر کے پسِ پردہ ہر جگہ حکیم و دانا خالق و صانع خداوند تعالیٰ کا دستِ قدرت نظر آئے گا وہ خداوند تعالیٰ کے نہ صرف وجود بلکہ کائنات میں اس کی کارفرمائی پر ایمان لے آئے گا۔ وہ یقین کر لے گا کہ یہ کائنات ایک بلند مقصد اور اعلیٰ حکمت کے لیے تخلیق کی گئی ہے ؎

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

طالب علم : اچھا صاحب ، یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی ، مگر یہ بتایئے کیا قیامت کا آنا ممکن ہے ؟

میں : بھائی - اب تو سائنس دان بھی قیامت کے آنے کے قائل ہو گئے ہیں۔

طالب علم : وہ کیسے ؟

میں : انیسویں صدی کے سائنس دان مدعی تھے کہ مادہ نہ گھٹتا ہے ، نہ بڑھتا ہے ، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا - اس وجہ سے وہ قیامت کے آنے کے منکر تھے ، مگر اب تو ذرہ کو توڑ دیا گیا ہے - اب تو مادہ فنا ہو گیا ہے۔

؎ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

اب تو وہ استدلال ہی ختم ہو گیا ہے - قیامت کی آمد کے حق میں دوسری بڑی شہادت علمِ ریاضی نے فراہم کی ہے - ریاضی کی ایک شاخ ہے حرارتی حرکیات (THERMO DYMA اس کے قانون نمبر دو نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں حرارت کی مقدار بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے - نیا اضافہ نہیں ہو رہا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارا نظامِ شمسی ایک دن بے نور ہو جائے گا خواہ وہ دن کتنے ہی کروڑوں سال کے بعد آئے - اس طرح سائنس دان پورے نظامِ شمسی کی جس میں ہماری دنیا بھی شامل ہے ، موت کی پیش گوئی کر رہے ہیں - اب تو وہ خود قیامت کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

طالب علم: آپ نے تو بڑے عقلی انداز میں تمام باتوں کو سمجھایا ہے۔ پھر ان سائنس دانوں کو اور مغرب کے فلاسفہ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں نہیں مانتے؟

میں: سنیے صاحب! میں نے جو طریقۂ استدلال استعمال کیا ہے وہ بالکل وہی ہے جو یہ سائنس دان استعمال کرتے ہیں۔

ڈارون نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ ارتقاء کی کڑیاں جوڑتے ہیں متحجر (FOSSILS) ڈھانچوں سے امداد لی گئی۔ کہیں سے کوئی کھوپڑی مل گئی، کہیں سے جبڑا مل گیا اور ان اجزا سے وہ سالم انسان پر استدلال کرتے ہیں۔ اور اپنے اس استدلال کی بنا پر انہوں نے انسان کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے: تحت انسان، انسان نما اور مکمل انسان۔

خارجی آثار دیکھ کر اس دور کے انسان کی عقلیت اور معنویت پر استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً کہیں قدیم ڈھانچہ کے ساتھ ہی راکھ بھی پڑی ملی تو نتیجہ نکالا کہ قدیم دور کا انسان آگ سے واقف تھا۔ حالانکہ انہوں نے نہ اس انسان کو دیکھا، نہ اس آگ کو دیکھا۔ کہیں قدیم ڈھانچوں کے ساتھ جانوروں کی ہڈیاں پڑی ملیں تو نتیجہ نکالا کہ قدیم زمانے کا انسان جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے شکار کرتے نہیں دیکھا۔

ایک اور علم آثارِ قدیمہ ہے۔ اس میں بتاتے ہیں کہ انسان پر ایک دور ایسا گزرا کہ وہ پتھروں کو بطور اوزار استعمال کرتا تھا۔ ان کی تراش خراش کر کے مفید مطلب بناتا تھا۔ ایسے پتھروں کے تیز دھار والے اوزار مختلف مقامات پر ملے ہیں۔ تراشیدہ ہونے کی بنا پر استدلال کیا گیا کہ یہ انسانی ذہن کا اور انسانی ہاتھ کا کام ہے۔ یہ خود بخود نہیں ہوا۔

ایک اور علم طبقات الارض ہے، وہاں بھی اسی طریقے سے استدلال کیا جاتا ہے مثلاً ہمالیہ پہاڑ پر تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر متحجر سیپ سکے ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ چیزیں سمندر میں بنی ہیں۔ پھر مزید استدلال کیا کہ ہمالیہ پہاڑ سمندر میں بنا ہے۔ اور یہ کہا گیا کہ اس سمندر کا نام (TYTHE SEA) ہے۔

غرضیکہ مختلف علوم و فنون میں سائنس دان خود اس طریقہ کو استدلال کرتے ہیں، کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اس طریقۂ استدلال سے مظاہرِ قدرت میں حکمت و

دانائی سے وجودِ باری تعالیٰ پر استدلال کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں یہ غلط ہے ۔ حالانکہ غلط ان کا طرزِ عمل ہے ۔ غیر سائنسی ان کا طرزِ عمل ہے ۔

چونکہ سائنس کی طفولیت کے زمانے میں سائنس دانوں کی پادریوں سے جنگ ہو گئی تھی اس کے ردِ عمل کے طور پر وہ مذہب سے بیزار ہو گئے ۔ اور خدا و آخرت سب کا انکار کر دیا ۔ اب نفرت کا جذبہ سائنس دانوں کے دل و دماغ میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ اگر کوئی شخص خود ان کے طے کردہ سائنسی طریقۂ استدلال کو استعمال کر کے ذاتِ باری کا اثبات کرتا ہے تو وہ یہ بات سننے کے روادار نہیں ۔ یہ محض ہٹ دھرمی ہے ۔ کل اگر پادریوں کی ہٹ دھرمی بری بات تھی تو آج سائنس دانوں کی ہٹ دھرمی بھی بری بات ہے اس لیے نوجوانوں کا کام ہے کہ سائنس دانوں کے بڑے بڑے ناموں سے مرعوب نہ ہوں ۔ اپنی سمجھ کو اور اپنی عقل کو بھی استعمال کریں ۔

طالب علم : بہت خوب ! آپ نے تو آج میری بہت ساری الجھنیں دور کر دیں ۔ مجھے اس گفتگو سے بے حد فائدہ ہوا ۔ اب آپ مجھے ایک اور بات دریافت کرنے کی اجازت دیجیے ۔

میں : فرمایئے !

طالب علم : آپ لوگ بزرگوں کو کیوں نہیں مانتے ؟

میں : انسان بھی عجیب مخلوق ہے ۔ اگر ان اڑے تو خدا کا بھی انکار کر دے اور جب نیچے گرے تو اس کے بندوں کو بھی خدائی تقسیم کرتا پھرے ۔

سنیے صاحب ! ہم بزرگوں کو مانتے ہیں ۔ وہ اللہ کے نیک بندے تھے ۔ وہ باعمل اور نیک کردار تھے ۔ انھوں نے لوگوں کو راہِ حق دکھائی ۔ انھوں نے اسلام کی اشاعت کی ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہو گا اور ان کے درجات بلند کرے گا ۔

اب میں یہاں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں ۔ اگر کوئی طالب علم بڑا محنتی ہو ، ذہین ہو ، با اخلاق ہو ، تمام اساتذہ اس سے خوش ہوں ، امتحانات میں بھی وہ اول آئے ، کالج کی انتظامیہ اس سے خوش ہو کر سونے کا تمغہ دے ، اس کا نام یادگاری تختہ پر لکھا جائے ، کیا ان تمام

باتوں کے باوجود اس طالب علم کو یہ اختیار مل جائے گا کہ وہ جس کو چاہے پاس کرا دے اور جس کو چاہے فیل کرا دے؟

طالب علم: یہ اختیار تو کالج انتظامیہ کے پاس رہے گا۔ وہ کسی کو نہیں دے سکتی۔

میں: بس معاملہ صاف ہوگیا۔ بزرگ کتنے ہی نیک ہوں، کتنے ہی مقربِ خدا ہوں، مگر وہ ہرگز خدا کی خدائی میں شریک نہیں ہوتے۔ مارنا، جلانا، اولاد دینا، رزق دینا، کامیابی دلانا، مغفرت کرانا یہ تمام کام خداوند تعالیٰ سے متعلق ہیں۔ کوئی دوسرا فرد نہ رسول نہ بزرگ ان اختیارات میں خداوند تعالیٰ کا شریک نہیں ہوتا۔ بزرگ کی بزرگی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اب وہ خدائی اختیارات کا مالک بن گیا۔

طالب علم: مگر لوگ کہتے ہیں کہ نیک ہستیاں جسے چاہیں جنت میں لے جا سکتی ہیں۔

میں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تو نہ کوئی بزرگ ہوسکتا ہے اور نہ کوئی ولی ہوسکتا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اعمال کی بنیاد پر بخشا جائے گا۔ آپؐ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ سے اور اپنی پھوپھی صفیہؓ سے فرمایا:

> "آخرت میں مَیں تمھارے کام نہ آسکوں گا۔ وہاں تمھارے اعمال تمھیں بخشوائیں گے۔ اس گمان میں نہ رہنا کہ میں رسولؐ کی بیٹی ہوں اور میں رسولؐ کی پھوپھی ہوں۔ لہٰذا نیک اعمال کرو"۔

آپؐ کے چچا ابوطالب تھے۔ آپؐ کی پرورش کی تھی۔ آپؐ پر بڑے مہربان تھے، مگر مرتے دم تک وہ رہے دینِ کفر پر۔ آپؐ نے آخری وقت ان سے کہا بھی کہ آپ کلمہ پڑھ لیں، تاکہ میں آپ کی سفارش کرنے کے قابل بن جاؤں، مگر وہ نہ مانے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے بلکہ پرورش کرنے سے نجات نہیں ملے گی تو کسی دروازہ کو چھونے سے کیسے نجات مل سکتی ہے۔ یہ سب اسلام کے منافی باتیں ہیں۔ جب رسول اللہؐ کسی فرد کو جنت میں بھیجنے کی ضمانت نہیں دیتے تو پھر دوسرے کسی فرد کو کہاں

کہاں سے یہ حق پہنچ گیا کہ وہ سب کو جنت میں داخل کر دے۔ گذشتہ زمانوں میں بہت سی غیر اسلامی باتیں اسلام میں گھس آئی ہیں۔

مگر یاد رکھو!

- جو بات قرآن میں ہے وہ اسلام ہے۔
- جو بات سنتِ رسولؐ میں ہے وہ اسلام ہے۔
- جس بات پر صحابہؓ اور تابعینؒ نے عمل کیا وہ اسلام ہے۔
- جو بات اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہے وہ اسلام ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بعد کے لوگوں کے اضافے ہیں، جن کی کوئی سند نہیں ہے، وہ ہرگز اسلام نہیں ہے۔

رزقِ حلال

جناب سید اسعد گیلانی صاحب - ایم - اے -

اسلام پاکیزگی اور طہارت کو پسند کرتا ہے اور ناپاکی اور گندگی کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کا یہ تصور زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے بارے میں ہے۔ رزق کے بارے میں حلال اور طیّب ہونے کا تصور اسلام نے اس شدّت سے پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف رزقِ حلال کو ہی اپنی طرف سے نعمت قرار دیا ہے۔ رزقِ حرام کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمت قرار نہیں دیتا۔

رزقِ حلال اسلامی معاشرے میں بیحد اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بارے میں تاکیدی احکام کافی دیئے گئے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو دُور دراز کا سفر کر کے حج کے لیے پہنچتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، سر سے پاؤں تک راہ خدا میں گردِ سفر میں اٹا ہوا ہے۔ ظاہری صورت میں وہ بڑا خدا رسیدہ انسان دکھائی دیتا ہے اور بے تاب ہو ہو کر رو رو کر ملتزم کو تھام تھام کر دُعائیں کرتا ہے لیکن حدیث کی تمثیل میں فرمایا گیا ہے کہ ایسے شخص کی دُعائیں اللہ تعالیٰ کیسے قبول کر سکتا ہے جب کہ اس کے جسم پر کپڑا حرام کی کمائی کا ہے اور اس کے پیٹ میں غذا حرام کمائی کی ہے۔ حرام کمائی کی کوئی عبادت بھی اللہ کو قبول نہیں ہے۔

رزق، انسان کے اخلاق و کردار پر زبردست اثر ڈالتا ہے۔ یہ صرف جسمانی قوت اور نشوونما کا ذریعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان کی رُوح کے لیے بھی یہی غذا قوت بہم پہنچاتی ہے۔ انسانی رُوح حرام غذا قبول نہیں کرتی اور نہ اس سے اس کی بالیدگی اور پرورش ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حلال رزق سے تو جسم اور رُوح دونوں توانائی حاصل کرتے ہیں، لیکن حرام رزق

سے حیواتی جسم تو تروتازہ ہوجاتا ہے۔ لیکن رُوح فاقہ کشی کرتی اور کمزور و ناتوان ہوجاتی ہے۔

عام طور پر رزق کا اطلاق کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں رزق صرف خوراک کے معنی تک محدود نہیں ہے، بلکہ عطا، بخشش اور نصیب کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دُنیا میں انسان کو دیا ہے وہ سب اس کا رزق ہے حتیٰ کہ اولاد بھی رزق ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق اور اس کی مدتِ عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں رزق سے مراد صرف وہ خوراک ہی نہیں ہے جو اس بچے کو ملنے والی ہے، بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اُسے دُنیا میں دیا جائے گا۔ خود قرآن میں ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ یعنی جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے احکام حلال و حرام صرف دسترخوان کی سرحدوں تک محدود سمجھنا سخت غلطی اور بہت بڑی بھول ہے۔

اسی غلطی کے نتیجے میں لوگوں نے کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال اور درست و نادرست کا مسئلہ تو ایک دینی مسئلہ سمجھ لیا ہے، لیکن تہذیب و تمدن مملکت و اجتماعیت کے وسیع تر معاملات میں خدا کے احکام اور اس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کرنے لگے ہیں اور یہ خدا کے احکام سے بے نیاز قانون سازی بڑے بڑے حساس متقیوں کو بھی احساس نہیں دلاتی کہ یہ چیز بھی اسی طرح دین کے احکام حلت و حرمت سے ٹکراتی ہے، جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں شریعتِ الٰہی سے بے نیاز ہونے سے غذا کے حلال و حرام اور پاک و ناپاک ہونے کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔

اسلام نے رزقِ حلال کے بارے میں قدم قدم پر تاکید کی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کھانے سے بہتر اور کوئی کھانا نہیں جو کوئی شخص اپنے ہاتھ کی محنت سے کما کر کھائے اور خدا کے نبی حضرت داؤدؑ اپنے ہاتھ سے ہی کما کر کھاتے تھے۔

۵۔ حضورؐ نے فرمایا ” لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ انسان کو جو کچھ ملے گا وہ اس کی

پروا نہیں کرے گا کہ یہ حلال ہے یا حرام"۔ (بخاری)

○ — حضورؐ نے مزید فرمایا" لوگوں پر حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں، جن کی حقیقت سے بہت سے لوگ واقف ہیں تو جو شخص شبہ کی چیزوں سے بچا اس نے اپنا دین بچا لیا۔ اور اپنی آبرو کو محفوظ رکھا اور جو شخص شبہ کی چیزوں میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہوا"۔ فرمایا: مشتبہ چیزوں کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے ایک چرواہا ہو جو کھیت کی مینڈھ کے پاس اپنے جانوروں کو چرائے اور ہر وقت اس کا خطرہ رہے کہ کوئی جانور کھیت میں گھس جائے۔ خبردار رہو کہ ہر بادشاہ کی ایک حد مقرر ہے اور خدا کی حد حرام چیزیں ہیں ۔ آگاہ رہو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب تک وہ ٹھیک رہتا ہے سارا بدن ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے اور وہ دل ہے"۔ (بخاری)

○ — حرام کمائی کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "جو بندہ مالِ حرام کمائے اور پھر صدقہ کرے وہ صدقہ قبول نہیں کیا جاتا اور جو شخص اس مالِ حرام کو اپنی ذات یا اپنے اہل و عیال پر صرف کرے تو اس میں برکت نہیں دی جاتی اور جو شخص مالِ حرام کو مرنے کے بعد چھوڑ جائے وہ مال اس کے لیے دوزخ کا توشہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بُرائی کو بُرائی سے دُور نہیں کرتا، بلکہ بُرائی کو بھلائی سے دُور کرتا ہے۔ ناپاک مال ناپاکی کو دُور نہیں کرسکتا (شرح السنۃ)

چنانچہ قرآن مجید میں سورۃ المومنون میں فرمایا گیا: "یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا"۔ (ترجمہ) "اے انبیاء کرام کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح"۔

یہاں پاک چیزوں سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو بجائے خود بھی پاکیزہ ہوں اور پھر حلال طریقے سے حاصل بھی ہوں ۔ طیّبات کھانے کی ہدایت کر کے رہبانیت اور دُنیا پرستی کے درمیان اسلام کی راہِ اعتدال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مسلمان نہ تو راہبوں اور جوگیوں کی طرح اپنے آپ کو پاکیزہ چیزوں سے محروم کرتا ہے اور نہ دُنیا پرستوں کی طرح حرام و حلال کی تمیز کیے بغیر ہر چیز پر منہ مار دیتا ہے۔

طیبات کھانے کے ساتھ عملِ صالح کا تذکرہ اس لیے ہے کہ حرام خوری کے ساتھ عملِ صالح کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ عملِ صالح کی سب سے پہلی شرط ہی یہ ہے کہ انسان رزقِ حلال کھائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: ”لوگو! اللہ خود پاک ہے اس لیے وہ پاک ہی چیز کو پسند کرتا ہے۔“

پھر آپؐ نے تمثیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار آلود و پراگندہ حال آتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتا ہے یارب! یارب! مگر اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ روٹی اس کی حرام، کپڑے اس کے حرام اور جسم اس کا حرام کی روٹیوں سے پلا ہوا۔ رب کس طرح ایسے شخص کی دعا قبول کرسکتا ہے۔“ (مسلم)

رزق ہر شخص کا مقدر ہوتا ہے وہ اسے ملنا ہی ہوتا ہے وہ چاہے تو اسے حرام ذرائع سے حاصل کرے اور چاہے تو حلال ذرائع سے حاصل کرے۔ حلال ذرائع اسے خود بخود نیک اور خدا کا صالح بندہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ اور حرام ذرائع اسے خود بخود بُرا اور خدا کا باغی بندہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگ صبر کی کمی اور توکّل کی قلت کے سبب محنت و مشقت سے جی چراتے ہیں اور حرام ذرائع رزق کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی بھول ہوتی ہے کہ رزقِ حلال مشکل ہے اور رزق حرام آسان ہے۔ ممکن ہے کہ بظاہر ایسا نظر آئے لیکن ذرا اس چور کی مشقت کا اندازہ کیجیے جو اپنی چند روزہ عیش کی خاطر اور محنت کے پسینے سے گھبرا کر رات کو جان ہتھیلی پہ لے کر نکلتا ہے اور پکڑے جانے پر جس کی ابتدائی سزا ہی سخت درجے کی بے عزتی اور مار پٹائی ہوتی ہے اور ہر وقت جان کا خطرہ ہوتا ہے، وہ ہر روز مرتا اور ہر روز جیتا ہے۔

ایک دفعہ انسان اگر یہ اطمینان کرلے کہ رزق کس طرف سے آرہا ہے اور انسانوں سے بڑی مخلوقات جو اربوں اور کھربوں کی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ جو زمین، پانی اور ہوا میں موجود ہیں وہ بھی تو اللہ کے خزانے سے ہی رزق پا رہی ہیں، اس کے بعد انسان کے لیے رزق کے بارے میں صحیح سمت اختیار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنا سب سے پہلا تعارف " رب العالمین " کے صفاتی نام سے ہی کرواتا ہے۔ گویا اس کی صفتِ ربوبیت جو رزق رسانی اور پرورشِ مخلوقات کی خود ضامن ہے سب سے پہلے بندوں کا اسی صفت سے تعارف کرایا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس میں ایمان و انکار کی شرط بھی نہیں ہے۔ گویا یہ صفت اس کی ہر قسم کی مخلوق کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ خالق کے ذمے اپنی مخلوق کی پرورش خود تسلیم کردہ ہے۔ اس میں مخلوق کی اس حیثیت کے سوا کہ وہ مخلوق ہے دوسری کوئی شرط نہیں ہے۔

ایک انسان کے لیے اس سے بڑی ضمانت کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مالک سے اپنے حصے کا رزق سیدھے، صاف، پاکیزہ اور حلال طریقے سے وصول کرے اور ادھر اُدھر کے حرام ذرائع استعمال کرنا چھوڑ دے۔ جب کہ خالق نے پرورشِ مخلوقات کو اپنے ذمے کا کام قرار دیا ہے اور بندگی، عبادات، اطاعت اور فرماں برداری کو مخلوق کے ذمے کا کام بتایا ہے۔ ہمارا کام اس کی بندگی کرنا ہے جیسے اس کی کائنات کی ہر شے اس کی اطاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔ رزق دینا اس کا کام ہے۔

رزقِ حلال کمانا اطاعتِ الٰہی کی ہی ایک صورت ہے اور رزقِ حرام کمانا انحرافِ اطاعتِ الٰہی کی ایک شکل ہے۔ ہمیں کائنات کی تمام مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اطاعتِ الٰہی کی روش اپنانی چاہیے۔ اطاعت کی یہ روش کائنات کی شاہراہ پہ کامل ہم آہنگی کی روش ہے لیکن انسان اطاعت کی کامل ہم آہنگی کو انحراف کے مختلف مظاہروں سے درہم برہم کرتا رہتا ہے اور انحراف کے ان مظاہروں میں رزقِ حرام کی روش پر چلنا اور رزقِ حلال کی جدوجہد سے اجتناب کرنا بھی شامل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا دوسرا مظہر سلسلۂ انبیاء کرام ہیں جو صرف بنی نوع انسان کے لیے ہے اس لیے کہ پوری کائنات میں صرف وہی انحراف کی روش کا ارتکاب کرتا رہتا ہے دوسری ساری مخلوقات کا طرزِ عمل جبلّی اور تکوینی طور پر کامل اطاعت کا ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبۃ اللہ کے بعد یہ دعا کی:

" اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں میں سے

جو اللہ اور آخرت کو مانیں انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے"۔
تو اس کے جواب میں رب العالمین نے اپنی ہمہ گیر رزاقی کے پیشِ نظر دعا میں فوراً اصلاح کر دی اور فرمایا:

"اور جو نہ مانے گا چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دُوں گا البتہ آخرکار اُسے عذابِ جہنم میں جانا ہوگا۔ جو بدترین ٹھکانہ ہے" (البقرہ: ۱۲۶)

گویا رزق رسانی خدا کی طرف سے ہے۔ یہ ایک متفق علیہ مُسلّمہ حقیقت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۂ یونس میں فرماتا ہے:

"ذرا ان سے پوچھو کہ کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں۔ کون بے جان سے جان دار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے، کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ! تو کہو پھر تم اس سے ڈرتے کیوں نہیں ہو"

جو لوگ رزقِ حرام کے لیے اپنی ہستی کو دوزخ کا ایندھن بنا لیتے ہیں کیا وہ حیوانات اور چرند و پرند سے بھی گئے گزرے ہیں۔ آخر اس زمین پر لاکھوں قسم کے حیوانات ہیں، جن میں سے ہر نوع کے کروڑوں اور اربوں افراد موجود ہیں اور ہر لمحہ نئے سے نئے وجود میں آ رہے ہیں، مَر رہے ہیں، پیدا ہو رہے ہیں۔ عمر کے مختلف مراحل میں ہیں۔ اور زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی ضروریات و حاجات بھی مختلف ہیں۔ ان کی صرف غذائی ضروریات کا ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے تو انسان دم بخود رہ جاتا ہے۔ لیکن ان سب کی غذائی ضروریات کا سامان اُن کی قریب ترین دسترس میں رکھ دیا گیا ہے اور وہ بے نیاز ہو کر خود بخود خوراک پاتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی خوراک سے محروم نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ اس فراہمیِ غذا میں اتنی بے شمار فطرت کی قوتیں زمین سے آسمان تک کام کرتی ہیں کہ انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ اگر سورج کی گرمی، ہوا کی روانی، پانی کی سیرابی، اور زمین کے مختلف مادّے ٹھیک ٹھیک تناسب سے باہمی مل کر غذا کا سامان مسلسل اور پیہم نہ کرتے رہیں تو اُن کو غذا کا ذرہ تک مہیا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ربوبیتِ الٰہی کے یہ سارے چاکر دم بخود اور چپ چاپ اس

کارخانۂ قدرت کے اندر مزدوروں کی طرح کام کرتے رہتے ہیں اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ تھکتے ہیں اور نہ عدم تعاون کرتے ہیں۔

یہ سارا انتظامِ رزق رسانی موجود ہے لیکن خدا کا ایک بے خبر، بے توکل بندہ یہ جانے بغیر کہ سارا کچھ اسی کے لیے ہے تاکہ اُسے رزقِ حلال فراہم کرے۔ وہ اپنے نفس کے دھوکے میں آکر رزق کے وہ ذرائع استعمال کرتا ہے جو ناپاک ہیں یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک عظیم الشان دسترخوان بچھا ہوا ہو اور اس پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوئے ہوں۔ لیکن کوئی شخص اِس دسترخوان کے پاکیزہ کھانوں کو چھوڑ کر گندی نالیوں میں ہاتھ مارے اور وہاں سے ناپاک اور گلی سڑی ہڈیاں نکال کر چچوڑے۔ اسے بدقسمتی اور بے عقلی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ ایسا شخص اگر دھکے کھاتا ہے اور اسے مقدر کا لکھا کہتا ہے تو اس کی عقل کا ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک روزی رسانی کا تعلق ہے سورۃ العنکبوت میں فرمایا گیا ہے:

"کتنے ہی جاندار ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کا رزق ان کو دیتا ہے اور تمھارا بھی وہی رازق ہے۔ وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے"۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے ہوئے اور اس کا خالص بندہ بن کر رہتے ہوئے آزمائشیں بہرحال آتی ہیں اور یہی آزمائشیں ہیں جن کو بلندیٔ درجات کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے مصیبت جان کر بے حوصلہ لوگ غلط راستوں کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

(باقی)

دفترِ وزارت کا آغاز و ارتقاء

جناب احمد حسن صاحب - انڈیا

بنی نوع انسان نے جیسے ہی کسی مملکت کی تشکیل کا اِرادہ کیا اسی وقت سے مختلف ادارے وجود میں آئے - جن میں سے کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جو تقریباً ہر مملکت میں موجود تھے - خواہ ان کی ہیئت اور حدود کچھ بھی رہی ہوں - جن میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVERIENGTY)، وزارت اور محکمۂ قضا، قابلِ ذکر ہیں - موجودہ مقالے میں دفترِ وزارت کے آغاز و ارتقاء پر اس طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نہ تو تاریخی حقائق سے انحراف ہو اور نہ ہی عرب یا ایرانی تہذیب سے متاثر ہونا ظاہر ہو۔

دفترِ وزارت کے آغاز پر مؤرخین و مفکرین مختلف الرائے ہیں - کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وزارت کے آغاز عرب میں ہوئی جب کہ کچھ مفکرین یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ایرانی ادارہ ہے - مثلاً پی - کے - ہٹی کا خیال ہے کہ یہ ایک ایرانی ادارہ ہے جس کو عباسی خلفاء نے اپنے نظامِ حکومت میں جگہ دی[1]

حسینی کے مطابق خلیفہ کے بعد وزیر کا عہدہ ہوتا تھا - اگرچہ لفظ "وزیر" عربی زبان کا ہے مگر یہ ادارہ ایرانی ہے[2]

---

[1] پی - کے - ہٹی - ہسٹری آف دی عربس (لندن) ۱۹۷۰ء ص ۳۱۸

[2] حسینی، عرب ایڈمنسٹریشن، دہلی ۱۹۷۶ء ص ۱۵۸ -

آر۔پی۔ترپاٹھی کا خیال ہے کہ مسلم مملکت نے جن چند غیر عربی اداروں کو اختیار کیا، ان میں وزارت بھی شامل ہے۔ دراصل اموی خلفاء نے اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کو مشاورت میں شامل کیا۔ مگر عباسی خلفاء ایرانیوں سے قربت کے سبب ان کی تہذیب و تمدن سے زیادہ متاثر ہوئے اور اس ادارہ کو بھی حکومت میں شامل کر لیا۔[1]

انل چندر بنرجی کے خیال میں وزارت بلاشبہ ایک ایرانی ادارہ ہے مگر لسانی اعتبار سے وہ اس کی ابتداء قرآن کریم سے تلاش کرتے ہیں۔

ایس۔ڈی۔گوئٹن یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے دفتر وزارت کہیں سے اخذ نہیں کیا۔[2]

فرینز بینگر نے لسانی اعتبار سے وزیر کو "اوستا" زبان میں تلاش کیا ہے اور "وسرا" کو اس کا ماخذ بتایا ہے۔ اس کے معنی جج یا قاضی کے ہیں۔ مگر عربوں نے ساسانی حکومت کے اس ادارہ کو اپنے نظام میں شامل کیا اور بعد میں ایرانیوں نے وزارت کو دوبارہ اپنی حکومت میں عرب ادارہ کی حیثیت سے شامل کر لیا۔[3]

اسی طرح ان مصنفین نے جن کی رائے میں ادارہ کی ابتداء ایران میں ہوئی اس کی اصطلاح عربی زبان میں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ہر ملک کی تہذیب اور ضروریات کے مطابق ادارے وجود میں آتے ہیں۔ اس لیے ان کی شناخت کے لیے اسی ملک کی زبان میں ان کے نام اور ان کی اصطلاحیں تلاش کی جانی چاہئیں۔ INSTITUTION کی زبان میں جدید مفکرین سارے مواد کو سامنے رکھنے کے باوجود اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ عرب اور ایرانی دونوں اقوام دیدہ و دانستہ اس جدوجہد میں مشغول تھیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک

---

[1] آر۔پی۔ترپاٹھی SOME ASPECTS OF MUSLIM ADMINISTRATION آلہ آباد ۱۹۵۶ء، ص ۱۶۱۔

[2] انل چندر بنرجی VAZAARAT UNDER THE SLAVE KINGS انڈین کلچر (۱۹۳۶ء) ص ۶۵۵۔

[3] فرینز بینگر ENCY OF ISLAM LEADEN (۱۹۳۶ء) ص ۳۶-۱۱۳۵

دوسرے سے بہتر اور بالاتر ثابت کر سکیں۔ لہٰذا دونوں نے انتظام ملکی کے تمام اداروں کے اپنے ملک سے متعلق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور خود کو ان کا موجد ثابت کرنا چاہا۔

مثلاً الماوردی (عباسیوں کے قاضی القضاۃ) نے قرآن و حدیث اور عربی تاریخ کے مختلف حوالوں سے زیادہ تر انتظامی اداروں کو نظریاتی بنیاد فراہم کی ہے جن میں خلافت، وزارت، قضاء وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ماوردی نے خلافت پر الاحکام السلطانیہ، وزارت پر ادب الوزیر، محکمہ قضا پر ادب القاضی اور آداب الحرب پر تعجیل النظر فی تحصیل الظفر جیسی مشہور کتابیں تصنیف کیں۔

ماوردی نے وزیر کے لیے قرآن کریم سے تین الفاظ کا انتخاب کیا ہے یعنی وزیر جو کہ "وزر" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بوجھ کے ہیں۔ یا "آزر" جس کے معنی پشت کے ہیں یا پھر یہ لفظ "وزر" سے مشتق ہے جس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ماوردی نے قرآنِ کریم ہی کو اس ادارہ کا بنیادی ماخذ تسلیم کیا ہے۔

اسی طرح الفخری کے مصنف طباطبائی نے بھی ماوردی کی تقلید کی ہے۔ البتہ وہ وزیر کو خلیفہ کا نائب تصور کر کے پیش کرتا ہے[1]۔

ابن خلدون وزارت کو اس کے دفتر کی ہیئت کے اعتبار سے پیش کرتا ہے لیکن اس کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمان اس ادارہ کے موجد ہیں[2]۔

اصفہانی باوجود فارسی مصنف ہونے کے ماوردی کی تقلید کرتا ہے۔ اس طرح عربی میں اس ادارہ کی بنیاد تلاش کرتا ہے[3]۔

قابوس نامہ کے مصنف عنصر المعالی نے وزیر کا تصور اس طرح پیش کیا ہے گویا وہ ایک امین ہے اور مملکت اس کی امانت میں دی گئی ہے۔

---

[1] طباطبا، الفخری۔ انگلش ترجمہ جی۔ ای۔ سی۔ وینگس لنڈن (۱۹۴۷ء)، ص ۱۴۵
[2] ابن خلدون۔ انگلش ترجمہ جلد ۲ W. ROUSENTHALL ص ۸-۱۴
[3] اصفہانی۔ سلوک الملوک۔ CH. 2. MS. BRITISH MUSEUM

سیاست نامہ کے مصنف نظام الملک طوسی نے وزارت کا مطالعہ دو طرح سے کیا ہے، اس کا خیال ہے کہ تقریباً تمام حکمران و پیغمبران اپنا ایک وزیر رکھتے تھے۔ نظام الملک نے جو جدول پیش کی ہے اس میں حضرت سلیمانؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بالترتیب وزراء آصف برخیاؑ، ہارونؑ، شمعونؑ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اور حکمرانوں میں کیخسرو، منوچہر، افراسیاب، گستاشپ، رستم بہرام غور، نوشیرواں عادل نے گدارز، سعام، پیرانو لیسا، جاماسب، زواریح خیرہ روز، بزرجمہر وغیرہ بالترتیب وزراء مقرر کیے۔[1]

سلجوقی عہد کے مشہور عالم امام غزالی نے بھی ایرانی حکمرانوں اور پیغمبروں دونوں ہی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ساسانیوں کے عہد سے دفترِ وزارت تسلیم کرتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی وزیر کے تقرر کا ذکر کرتے ہیں۔[2]

حاجی سیف الدین نے یونانی بادشاہوں کے علاوہ ایرانی حکمرانوں اور پیغمبروں کے وزراء کا بھی تذکرہ کیا ہے۔[3]

مندرجہ بالا تصانیف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو ادارہ جس ملک میں قائم ہو اس کی اصل کی تلاش اسی ملک کی زبان میں کی جانی چاہیے۔ اور ایک ادارہ جس ملک میں قائم ہوا ہے دوسرے ملک کی تاریخ سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کسی بھی ادارہ کا ارتقاء ہر ایک ملک میں وہاں کی اپنی ضروریات کے مطابق مناسب وقت پر بتدریج ہوتا چلا جاتا ہے۔ بسا اوقات اس سلسلے میں پہلے سے کوئی ایسی سوچی سمجھی کوشش بھی نہیں کرنی پڑتی اور کئی مرتبہ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی نام کا ذخیرہ مختلف ممالک میں موجود ہوتا ہے جس کی ظاہری

---

[1] نظام الملک طوسی، سیاست نامہ تہران (شمسی ۱۳۲۰) ص ۲۱۸-۲۱۷۔

[2] امام غزالی، نصیحت الملوک۔ BAGLE, F.R.C. ENG. TR. لندن

[3] سیف الدین حاجی بن نظام عقیلی۔ آثار الوزراء۔ تہران (۱۳۳۷ شمسی) صفحہ: ۱۴۶، ۳۹، ۲۹، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۲۔

شکل اگرچہ بہت سے ممالک میں یکساں معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقی شکل اور ارتقاء کلیتہً مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہم کو ایران میں بادشاہت، یونان میں مصر و روما کی حکومتوں، یا عربوں کے پرانے قبائلی ادارے جو اپنے شیوخ کی سربراہی میں قائم تھے، ان سب کی ظاہری شکل خلافت سے کسی قدر مماثل نظر آتی ہے یا عربوں ہی کے پرانے ادارۂ شیخ میں کسی حد تک تلاش کی جا سکتی ہے، مگر اس کا ارتقاء اور حقیقی شکل قطعاً مختلف ہے۔ اسی طرح وزارت بھی اپنی ظاہری شکل میں بہت سے ممالک کے متبادل اداروں سے مماثلت رکھتی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ عربی وزارت کا وجود تلاش کرتے وقت مصنفین ایرانی وزارت کی ظاہری شکل سے دھوکا کھا گئے ہیں۔

دراصل ہر ملک کی اپنی ضروریات کے مطابق دیگر تمام اداروں کی طرح وزارت کے لیے بھی اسی ملک کی زبان میں موزوں الفاظ بیان کیے گئے ہیں۔ دوسری زبانوں میں اس کے متبادل الفاظ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں لفظ منتری، اسی کو عرب میں وزیر کا نام دیا گیا۔ دیگر وزراء کو چندر گپت موریہ کے زمانے (۳۲۵ ق م) میں آمینۃ کہا گیا ہے [1]

اسی طرح بعد میں بھی ہری سین جو سمدر گپت کا وزیر تھا۔ منتری سندھی وگرہیکا کہلایا اور شاید کوئی دیگر شخص اس کے اختیارات میں مخل نہ تھا [2]

یونان میں سکندر کا وزیر ارسطو تھا اور اس طرح یہ ادارہ یونان میں اس وقت سے موجود ہے جب سے اس کی تاریخ کا علم ہوتا ہے [3]

جہاں تک عربوں کا تعلق ہے اس میں یہ تصور قرآن کریم کے علاوہ وہاں کی پرانی شاعری سے بھی ظاہر ہوتا ہے نیز یہ کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے معاہدے سے اس تصور کی کلی توضیح ہو جاتی ہے جس کی رو سے انصار باوجود اکثریت میں ہونے کے مہاجرین کی موافقت میں خود کو وزیر

---

[1] کوٹلیہ کا ارتھ شاستر DR. SHAMSTRY ENG. TR میسور (۱۹۶۷ء) ص ۱۵

[2] B. C. GOKHLEY، SAMUDRA GUPTA، BOMBAY (۱۹۶۲ء) ص ۶۵

[3] سیف الدین حاجی، آثار الوزراء ص ۱۷

کے عہدے پر فائز ہونے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اور مہاجرین قریش کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ دگو یہ معاہدہ پورے طور سے کسی وقت بھی عمل میں نہیں آیا)[1] جب کہ وزارت جیسی چیز حضرت عمرؓ بن خطاب کے زمانہ میں اُبھرنا شروع ہو جاتی ہے۔ آپ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو ملکی انتظام میں شامل کیا۔ اموی دَور حکومت میں کاتب، امیر حاجب دو ادارے باقاعدہ وجود میں آئے۔ لیکن امیر حاجب تو اپنے خصوصی معاملات میں آزادانہ اختیارات کا مالک تھا۔ کاتب اپنے اختیارات کو آزادانہ طور سے بالعموم عمل میں نہیں لاتا۔ مگر عباسی دَور میں وزارت باقاعدہ طور پر کام کرنا شروع کرتی ہے۔ جس کے ابوسلمان الخلال خاندان برامکہ وغیرہ قابلِ ذکر وزراء ہوئے ہیں۔ نیز عباسی حکومت کے زیر اثر قائم ہونے والی آزاد سلطنتوں نے بھی وزراء کو کافی اہمیت دی۔ مثلاً غزنوی عہد میں احمد حسن میمندی، سلجوقی عہد میں نظام الملک طوسی لاثانی وزیر ہوئے۔[2] اس کا مطلب یہ نہیں کہ وزارت کسی خاص تہذیب کے زیر اثر قائم ہوئی اور عباسی خلفاء نے اس ادارہ کو اس تہذیب سے اخذ کر کے اپنایا۔ اس لیے کہ جہاں تک عربوں پر دوسری تہذیبوں کے اثرات کا تعلق ہے یہ کہنا محال ہے کہ کس مُلک کی تہذیب نے ان کو اس حد تک متاثر کیا کہ انتظامِ مُلکی کے ادارہ بھی اس تہذیب کے پیرائے میں ڈھلنے لگے۔ ہندوستان سے عربوں کے نہ صرف تجارتی تعلقات تھے، بلکہ اسلام کی آمد سے قبل دونوں تہذیبیں مذہبی اعتبار سے بھی کافی مماثلت رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ ماہرینِ لسانیات بھی اپنے مطالعہ میں ان اثرات کو تلاش کیے بغیر نہ رہ سکے۔ مثلاً قرآن کریم میں مشک کافور اور زنجبیل کے بارے میں خیال ہے کہ یہ الفاظ سنسکرت زبان سے اخذ کر کے معرب کر دیے گئے ہیں اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔[3]

اس طرح عرب (ROMAN EMPIRE) سے بھی بالعموم مسلسل جنگوں میں مصروف رہے، لہٰذا رومی تہذیب و تمدن کے بھی اثرات کے امکان موجود ہیں۔ ایرانی تہذیب کے

---

[1] بلاذری۔ انساب الاشراف حصہ اوّل۔ کیرو (۱۹۵۹ء) ص ۵۸۰ اور الاحکام السلطانیہ ص ۲۲

[2] برہان (اپریل ۱۹۶۲ء) ص ۲۰۱ تا ۲۰۰

[3] قاضی اطہر مبارک پوری، عرب و ہند عہد رسالت میں ص ۲۰۳ تا ۲۰۴ ۔ دہلی ۱۹۶۵ء

بارے میں کچھ کہنا تقریباً غیر مناسب ہے اس لیے کہ ایران و عرب کے آپس کے اختلافات اور اثرات کو تقریباً سب تسلیم کرتے ہیں - اس مقالہ کا حاصل یہ ہے کہ:

۱- ہر ادارہ کی ابتداء ہمیں ہر ملک کی تاریخ اور سیاسی ضروریات کے پیش نظر علیحدہ علیحدہ تلاش کرنی چاہیے - نیز یہ کہ کسی ادارہ کی دو ملکوں میں ظاہری ہیئت کی مماثلت اس بات پر یہ دلالت نہیں کرتی کہ دونوں ممالک میں ایک ہی ادارہ تھا - بلکہ اس کی حقیقی شکل کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے، جو اسی ملک کی تاریخ کی روشنی میں ممکن ہے جس کے ادارہ کو زیر مطالعہ لایا جارہا ہے، مثلاً امریکہ اور ہندوستان دونوں میں صدر کی اصطلاح ظاہری شکل کے اعتبار سے ایک معلوم ہوتی ہے مگر حقیقتاً دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں - اسی طرح یہ کہنا مناسب ہے کہ وزارت کے ادارہ کو بھی اس کی حقیقی اور اداری شکل کے اعتبار سے مطالعہ کرنا چاہیے - محض لسانی اصطلاح (TERM) کے اعتبار سے نہیں - مثلاً جو لوگ وزیر کو اوستا کے وسرا سے موازنہ کرتے ہیں - وہ یہ فراموش کرتے ہیں کہ وسرا صرف منصف کے معنی میں استعمال ہوتا تھا - جب کہ انصاف کا عمل مسلم حکومت میں ایک قاضی انجام دیتا تھا - اور وزراء صرف اس وقت دخل اندازی کرتے تھے جب خلفاء ان کو ایسا کرنے کے لیے حکم دیتے تھے -

یونانی بادشاہ کا معاون بھی عرب وزیر کا ہم پلہ نہیں ہوتا تھا - اس لیے مشاورت عرب وزیر کا صرف ایک میدانِ عمل تھا -

موریہ اور سمدر گپت کے دور کے ہندوستانی منتری عرب وزیر کے تصور سے کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں - اس لیے کہ ہندوستانی منتری گاڑی کے دو پہیوں میں سے ایک تھا[1] - اور جو تصور سقیفہ بنی ساعدہ کے معاہدہ سے ابھر کر سامنے آتا ہے اس سے بھی اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ امام اور وزیر کے درمیان عربوں کی نظر میں بہت زیادہ فاصلہ نہ تھا، ورنہ انصار کی اکثریت مہاجرین کو امام اور خود کو وزیر ماننے پر رضامند نہ ہو جاتی -

۲- ادارہ وزارت کا کیریکٹر دو خاندانوں کے آپس کے تعلقات کی بنیاد پر پیش کرنا بھی غیر مناسب ہے جیسا کہ گوئٹن نے خاندان ساسانیان و برامکہ اور عباسیہ کے آپس کے تعلقات کی بنیاد پر کیا ہے -

[1] ارتھ شاستر ص ۹

۳ - یہ کہنا بھی غیر مناسب ہے کہ عباسی خلفاء نے شام سے بغداد میں دارالخلافہ منتقل کرنے کی وجہ سے ایرانی اثرات کو قبول کیا - اور یہ ادارہ بھی اسی منتقلی کے اثرات سے وجود میں آیا - بلکہ عباسی انقلاب میں ایرانیوں کے اہلِ تشیع حضرات موالی اور دیگر غیر عرب اقوام نے عباسیوں کا ساتھ دیا - اس لیے کہ وہ صرف عباسیہ کو اپنی زیادتیوں کی مدافعت کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے - اور عباسی خلفاء بھی ان کے اثرات اور ان کی سیاسی اہمیت سے بخوبی واقف تھے - اس لیے انہوں نے اختیارات میں ان کو شریکِ کار بنایا - مثلاً ابوایوب موریانی (وزیر اول) یحییٰ برمکی، فضل بن سہل، اسماعیل بن بلبل العلقمی البرز غیر عرب تھے - اس امر کی تصدیق تاریخ کے صفحات پر ایک نظر ڈالنے سے مزید ہوتی ہے کہ جس قوم نے عباسی خلفاء کو با اختیار بنایا اسی قوم نے ان کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ ایک خلیفہ اپنی ذات کی بھی حفاظت نہیں کر سکتا تھا - مثلاً آل بویہ کے زمانے میں شاید ہی کوئی خلیفہ ایسا ہو جو اپنی موت مرا ہو - یا جس کو جسمانی اذیتیں نہ پہنچائی گئی ہوں - اسی طرح سلجوقی و خوارزمی عہد میں خلفاء کی مرضی کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا - یا منگولوں کے حملے کے وقت عباسی وزیر برز العلقمی ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے خلیفہ کا ساتھ چھوڑا اور منگولوں سے جا ملا -

۴ - قرآن کریم اور اسلام کی آمد سے پہلے کی شاعری میں دفتر وزارت کا جو تصور موجود ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر ممالک کی طرح عربوں میں بھی یہ ادارہ ان کی اپنی ہی ضروریات کی اختراع ہے اور ایرانی یا اور کسی تہذیب کا ادارہ مان کر یہ کہنا کہ عرب اس ادارہ کے موجد نہیں تھے شاید غیر مناسب ہے - جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر قوم و ملک کی ایک سیاسی ضرورت تھی - اس امر کی توضیح فاطمی خلافت کے سیاسی ڈھانچہ سے بھی ہو سکتی ہے - چونکہ مصر میں سنی مسلمانوں کی اکثریت تھی اور فاطمی خلفاء شیعہ تھے، لہٰذا اکثریت کو طاقت کے بجائے رغبت سے مطیع کرنا ضروری تھا - انہوں نے بھی بالعموم اکثریت ہی میں سے اپنے وزراء مقرر کیے[1]

---

[1] فاطمی خلیفہ معز الدین باوجود ذاتی اختلافات کے اپنے سنی وزیر ابوالفضل جعفر بن فرات کو محض سیاسی ضروریات کی بنا پر معزول کرنے سے قاصر رہا - ابن خلکان جلد اول ص ۱۱۹

ایک خصوصی نوٹ

مجرا

نعیم صدیقی

باکسنگ کی دنیا کے عالمی چیمپئن محمد علی امریکہ سے اسلام کی محبت میں پاکستان تشریف لائے۔ شاید انہیں خیال ہوگا کہ یہاں اسلامیت کی کچھ لمحات ایسی ان کو حاصل ہوں گی جو امریکہ میں یا کسی اور جگہ نہیں مل سکتیں، اور پھر وہ اپنے قلب و روح کے آئینے میں نئی نئی تجلیاتِ حق دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مگر پاکستان کے مسلم لیگی حکمرانوں کے اسلام کی تجلیات کچھ اور ہی نکلیں۔ اس امرِ واقعی کا بہترین آئینہ دار نوائے وقت کا ایک موثر نوٹ ہے۔ نوائے وقت پر زمانہ خواہ کیا کیا اثرات ڈالتا رہے، اس کے ضمیر میں جب اسلامی جذبے سے کوئی جنبش ہوتی ہے تو وہ بات کہہ گذرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

> پنجاب اسمبلی کے ایک رکن نے باکسنگ کے عالمی چیمپئن محمد علی کے اعزاز میں محفلِ رقص و سرود کے انعقاد کے خلاف جب تحریکِ استحقاق پیش کی تو اس کی مخالفت کرتے ہوئے پنجاب کے پارلیمانی سیکرٹری سعید ظفر نے کہا کہ مجرا کرانے پر کوئی آئینی و قانونی پابندی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تحریکِ استحقاق پیش کرنے والے رکن اسمبلی خود مجرا کرانا چاہئیں تو حکومت اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کریگی۔ رقص و سرود اور مجرا کے بارے میں آئینی اور قانونی پوزیشن کچھ بھی ہو، سرکاری یا نیم سرکاری تقریبات میں اس کی حوصلہ افزائی ایک اسلامی ملک میں ہرگز قابلِ فخر

قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ محمد علی تو اپنے آپ کو خادمِ اسلام کی حیثیت سے متعارف کرا رہا ہے اور ساری دنیا میں تبلیغِ اسلام کے لیے کوشاں ہے، لیکن ہم اس کی پذیرائی رقص و سرود اور مجرے کے ذریعے کرتے ہیں۔ اگرچہ صوبائی پارلیمانی سیکرٹری نے دعویٰ کیا ہے کہ اس مجرا بازی سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن کیا وہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن جس کے زیرِ اہتمام محمد علی کو مجرے والا استقبالیہ دیا گیا، سراسر حکومت کی گرانٹ پر چل رہی ہے۔ اس لیے حکومت اس مجرے سے بری الذمہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ ہمیں افسوس ہے کہ پنجاب حکومت نے محمد علی کے اعزاز میں مجرے کی حمایت کر کے عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ خدا جانے پارلیمانی سیکرٹری نے مندرجہ بالا بیان دے کر پنجاب حکومت، مسلم لیگ یا اپنی عزت میں کیا اضافہ کیا ہے۔ اور ایک نظریاتی ملک کے لیے قربانیاں پیش کرنے والوں کا مذاق کیوں اڑایا ہے؟ (ادارتی نوٹ۔ نوائے وقت)

اب آئیے ذرا پنجاب اسمبلی کے ایوان میں چلتے ہیں، جہاں اس معاملے میں تحریکِ استحقاق جناب اصغر علی گوجر کی طرف سے پیش ہوئی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

چوہدری اصغر علی گوجر سابق عالمی چیمپئن محمد علی کی لاہور آمد پر ان کے اعزاز میں منعقد کی جانے والی محفل میں رقص و سرود کا اہتمام کرنے کے مسئلہ کو "استحقاق مجروح" ہونے کی بنا پر اسمبلی میں زیرِ بحث لانا چاہتے تھے۔ چوہدری اصغر علی کا موقف تھا کہ محمد علی کے استقبال میں حکومت کے اعلیٰ افسر شریک تھے، انھوں نے لاہور میں قیام سے متعلق تمام امور کو طے کیا۔ بہت سے سرکاری افسر متذکرہ محفلِ رقص و سرود میں بھی موجود تھے۔ اس سے حکومت کی ان کوششوں کی نفی ہوتی ہے جو وہ اسلام کی ترویج کے لیے کر رہی ہے۔ حکومت نے بار بار ایوان میں بھی یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ اسلام کے منافی اقدامات کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے۔ لیکن متذکرہ واقعہ حکومت کی ان یقین دہانیوں کے منافی ہے۔ جس سے ایوان کا استحقاق مجروح

ہوا ہے۔ یہ ملک، حکومت اور اسمبلیاں اسلام کے نام پر قائم ہیں۔ اس لیے جس دار سے نے یہ فعل کیا ہے اُسے سزا دینی چاہیے۔ اس لیے تحریک کو استحقاق کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔

پارلیمانی سیکرٹری سعید الظفر نے تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ رقص و سرود کی محفل کا اہتمام ایک پرائیویٹ ادارے نے کیا تھا۔ محمد علی بھی اسی ادارے کی دعوت پر پاکستان آئے تھے۔ متذکرہ واقعہ بھی حکومت کی زیر سرپرستی یا حکومت کے ایما پر نہیں ہوا اور نہ ہی حکومت کے کسی ذیلی ادارے نے اس سلسلے میں تعاون کیا ہے۔ رقص و سرود کی محفل میں سرکاری افسروں کی موجودگی محمد علی کے تحفظ کے نقطۂ نظر کی وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ تاہم یہ امر بھی واضح رہے کہ مجرا کرانے پر کوئی آئینی اور قانونی پابندی نہیں ہے۔ اس لیے چوہدری اصغر علی گوجر اگر مجرا کرانا چاہتے ہیں تو کرا سکتے ہیں۔ حکومت کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرے گی۔

سپیکر نے اس پر تحریکِ استحقاق کو خلاف ضابطہ قرار دے دیا۔

اب ذرا ایک غیر مسلم بھارتی حکومت کے متعلق بھی ذیل کی خبر نقل ملاحظہ فرمائیں۔ اس کا عنوان ہے "بھارت میں مجرے پر پابندی" خبر یوں ہے:-

نئی دہلی۔ (جنگ فارن ڈیسک) بھارت میں مجرے پر پابندیاں ہیں اور مجرا کرانے کے لیے تھانے دار سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک کی منظوری ضروری ہے۔ ایک بھارتی اخبار نے لکھا ہے کہ اسلام کے کٹر قانونوں کی پابندی کرنے والے (؟) پاکستان میں مجرا کرانا کوئی گناہ نہیں ہے جب کہ سیکولر بھارت میں اس پر پابندی ہے۔ خبر میں مزید بتایا گیا ہے کہ بھارت میں مجرا یا تو چوری چھپے ہوتا ہے یا بڑے بڑے ہوٹلوں میں۔ (روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۸۷ء۔ ص ۸ کالم ۵)

اب ذرا سعید ظفر صاحب کے ان الفاظ کو تازہ کیجیے کہ "مجرا کرانے پر کوئی آئینی و قانونی پابندی نہیں"۔ ملاحظہ ہو کہ کتنا شدید احترام ہے رائج شدہ قانون کا۔ اگر کوئی پابندی قابلِ لحاظ ہے تو صرف وہ جو موجودہ آئین و قانون کی طرف سے عاید ہو۔ ایسا جذبہ و احساس سعید ظفر

(باقی برصفحہ ۴۶)

رسائل و مسائل

جماعتِ اسلامی کیا ہے؟

نعیم صدیقی

سوال: کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ جماعتِ اسلامی محض ایک عام سیاسی پارٹی کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے یا اس کا کردار اسلامی و انقلابی جماعت کے طور پر اُبھرا اور نمایاں ہو رہا ہے؟

اسلامی انقلاب محض اسلام کی دانش ورانہ و علمی فوقیت و برتری سے برپا ہوگا یا اللہ تعالیٰ کی سنّت کے حساب سے عملاً اسلامی نظام قائم و دائم ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کھلا اور صاف فرمان ہے کہ نہ اس کی سنّت میں کبھی تبدیلی ہوئی، نہ ہوتی ہے اور نہ ہوگی؟

جواب:۔ یہ بات کہ جماعت اسلامی کس حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے، اپنی جگہ ایک الگ موضوع ہے۔ مگر اس وقت اہم پہلو یہ ہے کہ ہم لوگوں نے جماعت کو کس نقشے پر کھڑا کیا۔ اور اب تک کس شعور اور کس مقصد سے اس کا کام چلایا۔ اُصولی طور پہ یہ دینی جماعت ہے۔ اور اس کے سامنے چونکہ اقامتِ دین کا مقصدِ اعلیٰ ہے جس کی راہ میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی رکاوٹیں ہیں، اس لیے اس کا راستہ محنت و جہاد کا وہ سخت راستہ ہے جسے آج کل انقلابی راستہ کہتے ہیں۔ دونوں باتوں کو جمع کریں تو جماعتِ اسلامی ایک اسلامی انقلابی جماعت ہی قرار پاتی ہے۔

یہ آپ کو مغالطہ ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر سے اسلامی انقلاب محض اسلام کی دانشورانہ و علمی فوقیت و برتری سے برپا ہوگا۔

اسلام کے غلبے کی مہم بہت سے تقاضوں کو پورا کرنے سے نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ایمانی و تعبدی پہلو، اخلاقی پہلو، تنظیمی پہلو، دعوتی پہلو، عملی سرگرمیوں کا پہلو، علمی و ادبی پہلو اور سیاسی پہلو۔ ان میں سے کسی بھی چیز کو لفظ "محض" کے ساتھ آپ اگر ذریعۂ انقلاب قرار دیں گے تو یہ جماعت کا نقطۂ نظر نہ ہوگا۔

علمی برتری ویسے اپنی جگہ بڑی وقعت رکھتی ہے۔ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۶۵ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سے اگر سو افراد ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب آئیں گے، "کیونکہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے"۔ کیا سمجھ نہیں رکھتے؟ اوّل تو یہ کہ جنگ کے لیے جو نظم اور ضوابط مسلمانوں نے نبیؐ کی رہنمائی میں دین کے مطابق اختیار کیے تھے وہ علمِ حق اور سمجھ بوجھ کا نتیجہ تھے۔ لیکن زیادہ اہم یہ بات ہے کہ کفار علمِ آخرت کے لحاظ سے کورے تھے اور مسلمانوں کے اندر آخرت کی حیاتِ دائمی اور شہادت کے نورانی ثمرات کا شعور موجود تھا۔

علاوہ ازیں علمی برتری تو آپ کو سیمیناروں میں، مکالموں اور مذاکروں میں، ادب اور صحافت میں، زندگی کو سنوارنے اور باریک تہذیبی احساسات پیدا کرنے میں ایسا مقام دلواتی ہے کہ آپ حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکلتے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ ساتھ دعوتِ حق بھی عروج حاصل کرتی ہے۔

آدمی اپنے نظریہ و مقصد کو صرف جاہل عوام پر واضح کر سکے، مگر فلسفیوں پر، وکلا پر، پروفیسروں پر، ایڈیٹروں پر، وزیروں پر اور جرنیلوں پر واضح نہ کر سکے تو دعوت ایک چھوٹے حلقے میں محصور رہے گی۔ ہر طبقے اور ہر دائرے میں غلبے کے لیے جملہ اقسام کے علوم کی برتری مطلوب ہے۔ سلف میں بھی بے شمار علمی کام غلبۂ اسلام کے لیے کیے گئے، ماضی قریب میں بھی ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔

مگر ہم صرف قرطاس و کتاب تک محدود نہیں رہتے۔ خدمتِ خلق بھی کرتے ہیں۔ جیلوں میں بھی جاتے ہیں۔ جبر و تشدد بھی سہتے ہیں ــــ مصر میں، سوڈان میں، شام میں، بنگلہ دیش میں اور دنیا کے ہر گوشے میں لوگ پتھر کھاتے ہوئے جادۂ عشق پر رواں ہیں۔

سیاست کے دائرے میں بھی ہم دعوت کے راستے نکالتے ہیں اور اصلاحِ احوال چاہتے ہیں۔

مگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ سیاست اتنی غالب آجائے کہ دینی و اخلاقی قدریں دب جائیں اور ہماری اساسی دعوتِ عام بے جان ہو جائے۔ یہاں تک کہ جماعتِ اسلامی کو محض ایک سیاسی پارٹی سمجھا جانے لگے۔ اگر کچھ لوگوں کو ایسی غلط فہمی ہے تو ہمیں اپنے طرزِ عمل اور پالیسیوں کے توازن سے اسے جلد سے جلد رفع کر دینا چاہیے۔

ہم دین اور سیاست کو دو الگ الگ چیزوں کی حیثیت سے لے کر پھر ان کا ایک مرکب تیار نہیں کرنا چاہتے کہ اتنے گرام دین اور اتنے اونس سیاست۔ بلکہ ہم پہلے سے سیاست کو معاش، معاشرت، تعلیم کی طرح دین کا اپنا ایک تقاضا سمجھ کر کام کرتے ہیں۔

پس نہ دارومدار صرف علمی سرگرمیوں پر ہے، نہ محض سیاسی جدوجہد پر، بلکہ ان کے اپنی جگہ ضروری ہونے کے باوجود اقامتِ دین کی مجموعی مہم انقلابی نوعیت کی ہے۔

"سنت اللہ" کے متعلق آپ کا ایک جملہ پڑھنے سے بات بہت واضح تو نہیں ہوتی مگر یہ حقیقت ضرور کھل جاتی ہے کہ اس کا صحیح مفہوم اور دعوتِ دین اور جماعت دین سے تعلق آپ پر واضح نہیں ہو سکا۔

سنت اللہ کی اصطلاح قرآن میں جہاں جہاں استعمال ہوئی ہے، ان مواقع کو آپ بغور دیکھیں۔ سنت اللہ ایک ایسا قانونی نظام ہے جس کا بیشتر حصہ تقدیر سے متعلق ہے اور بہت سے حقائق غیب میں رہتے ہیں۔ اور ایک حصہ جو تدبیر سے متعلق ہے وہی ہمارا محورِ فکر ہے۔ مگر تدبیر والے حصے میں بھی تدبیر کا پوری طرح عمل میں آجانا اور اس کے لیے وسائل کا جمع ہو جانا، اس کے لیے اعلیٰ درجے کے افراد کا مل جانا، ان افراد میں محبت، اتفاق اور نظم کا مسلسل کارفرما رہنا، پھر رونما ہونے والے حالات و واقعات سے اثر لینا اور اثر ڈالنا، اور آخر میں کسی نتیجے کا برآمد ہونا: یہ سب کچھ بھی انسان کے بس میں نہیں ہے۔

سنت اللہ کا مطالعہ قرآن اور تاریخ کی روشنی میں یہ بتاتا ہے کہ اگر کوئی دعوت یا مقصد برحق ہو، اُسے صحیح طور پر پیش کیا جائے، اُسے پیش کرنے والوں کا ایمانی، اخلاقی اور تنظیمی معیار اعلیٰ درجے کا ہو، مخاطب معاشرے کا انسانی مواد کم سے کم اوسط درجے کی اچھی کوالٹی کا ہو اور لوگ دعوت کو بکثرت قبول کریں، پھر تاریخ کے مدوجزر بھی مفید ثابت ہوں

تو نتیجہ مطلوبہ برآمد ہو سکتا ہے۔ ان "ضروریات" میں کوئی ایک ضرورت پورا ہونے میں بھی کسر رہ جائے تو از سرِ نو مساعی کرنی پڑتی ہے۔

"سنت اللہ" کا تصور یہ نہیں کہ آپ اس انتظار میں بیٹھ جائیں کہ سنت اللہ اپنا کام کر رہی ہے، وہ کرتی رہے گی اور وہی اسلامی انقلاب کو نافذ کر دے گی۔ سنت اللہ اس طرح خلا میں کام نہیں کرتی کہ آپ کچھ کریں کرائیں نہیں اور کام بن جائے۔ کسان کھیتی کو نہ جوتے نہ بوئے، مگر فصل بھرپور اُگ آئے۔

اب آپ ان گذارشات پر غور کریں اور کسی بات کی وضاحت کی مزید ضرورت ہو تو یہ ناچیز ہر خدمت کے لیے حاضر ہے۔ جہاں تک وقت اور قوت ساتھ دے۔

(بقیہ مجرا)

کے ایمان نے اُن کے اندر اسلامی قانون و شریعت کے لیے پیدا نہ کیا کہ وہ یوں سوچتے کہ ہمارے دین و تہذیب میں فلاں چیز روا یا ناروا ہے۔ کاش کہ وہ کہتے کہ اگر مروجہ آئین و قانون کی رُو سے مجرا کے جواز کی راہیں نکالی بھی جا سکتی ہوں تو قرارداد مقاصد اور دستور کی دوسری اسلامی دفعات اور معاشرے کے تصورِ اخلاق اور نظامِ اقدار کے تحت ایسی چیزوں کا معاشرے میں ہونا ناجائز ہے اور ہمیں خدا اور رسول کے احکام اور ان کے متعلق ملت کی رائے عام کا پاس کرتے ہوئے غلط چیزوں کو نہیں ہونے دینا ہے۔ آئندہ کے لیے ہماری کوشش ہے کہ ایسے تمام معاملات قانونی طور پر ہمارے یہاں شریعت کے مطابق طے ہو جائیں اور جلد سے جلد امن و احتساب کے ادارے اور عدالتیں اس قابل ہو جائیں کہ وہ قانونی قوت سے غلط چیزوں کو روک سکیں۔

مطبوعات

یادِ رفتگاں (۲) | رشحاتِ قلم جناب ماہر القادری۔ مرتبہ: طالب الہاشمی۔ ناشر: حسنات اکیڈمی ۱۹-اسی، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۱۸۔ کتابت و طباعت اچھی، جلد، سرورق خوب۔ صفحات: ۴۸۶۔ قیمت: -/۶۰ روپے (زیادہ نہیں)

جناب طالب الہاشمی اور حسنات اکیڈمی مستحقِ تبریک ہیں کہ انہوں نے باہمی تعاون سے ماہر القادری مرحوم کی علمی، ادبی تحریروں کو جمع کر کے شائع کرنے کا اہتمام کیا اور اُردو زبان کی زینت کے لیے ایک شاندار گلدستے کو محفوظ و مزین کر دکھایا۔ یہ کام ابھی جاری ہے۔ بہت سے اہلِ قلم و سخن کے ذریعے ہونے والے اچھے اچھے کام ان کی وفات کے بعد زینتِ طاقِ نسیاں بن جاتے ہیں۔ ماہر صاحب کے نام کو نمایاں رکھنے کی مساعی بہت قابلِ قدر ہیں۔

اس کتاب کے حصہ اول پر ہمارے ہاں تبصرہ ہو چکا ہے۔ اس پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ نئے لوگوں سے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ رنگا رنگ انسانی شخصیتوں کی خاکہ نگاری کے ایوان کی سیر کیجیے۔ آپ کو یوں محسوس ہونے لگے گا کہ آپ ان کے سامنے اُٹھ بیٹھ، چل پھر رہے ہیں اور ان کی باتیں سُن رہے ہیں۔ شخصیتوں کے جلووں کے ساتھ ساتھ آپ قرطاس کے چلتے فلم پر تاریخ اور سماج اور نجی زندگیوں کے بہت سے واقعات کو بھی رونما ہوتا دیکھیں گے۔ اس دوران میں آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ ساکن نہیں ہیں، بلکہ ماہر القادری صاحب کا حسنِ بیان آپ کو حالتِ پرواز میں لے آیا ہے۔ اُڑتے اُڑتے آپ طویل و عریض سیرگاہ میں علماء، ڈاکٹروں، فاضلوں، شاعروں، ادیبوں، خادمانِ اسلام، فقراء، انقلابیانِ حق، نکتہ دانِ

لسانیات، سرکاری افسروں اور ہر طرح کے نمونہ ہائے انسانیت کو قریب سے دیکھیں گے اور وہ کچھ جانیں گے جو پہلے نہیں جان سکے۔

صحیح راہِ عمل | مصنف: عبدالقادر عودہ شہیدؒ۔ مترجم: محمد حنیف۔ ایم اے۔
ناشر: مکتبہ چراغِ اسلام ۵/۱ قذافی مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور۔ قیمت ۱۲/- روپے

اس مختصر کتاب میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ قانونِ الٰہی یا قانونِ انسانی؟ صحیح راہِ عمل کیا ہے۔ مصنف شہید کی رائے یہ ہے کہ اسلامی شریعت سے ہماری روگردانی کی وجہ یہ ہے کہ ہم شریعت کو جانتے ہی نہیں۔ اور ہمارے علما بھی عوام کو صحیح طریقے سے قانونِ شریعت سے واقف کرانے میں ناکام رہے ہیں۔ مصنف شہید کے نزدیک سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ اپنے بھائی کو اسلامی شریعت سے روشناس کرایا جائے۔ نیز اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ تمدن اور سیاست اور قانون کے طلبہ کے شکوک و شبہات دُور ہوں۔

کتاب کے مباحث میں یہ چیزیں بھی شامل ہیں کہ اسلام کے احکام دین اور دُنیا دونوں کے لیے ہیں۔ یہ مکمل اور دائمی شریعت ہے۔ شریعت ہر چیز سے بالاتر ہے۔ اقتدار اور قانون سازی اس کے تحت ہونی چاہیے۔ اور اصحابِ اقتدار حُدود سے تجاوز نہ کریں۔ دوسرے ایک باب میں مسلمانوں کے مختلف طبقات پر اس لحاظ سے بحث کی گئی ہے کہ کون کس وجہ سے راہ شریعت میں رکاوٹ ہے۔ اور بڑی دردمندی سے ہر طبقے کے لوگوں کو غلبۂ شریعت کے کام کے لیے پکارا گیا ہے۔

قرآن کی محفل | از ڈاکٹر محمد احمد واسطی۔ ناشر: واسطی پبلیکیشنز۔ ۱ ایم۔ مجاہد آباد۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی ۴۲ قیمت: ۲۵/- روپے

یہ بھی ایک خدائی انتظام ہے کہ ہر دور میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق مختلف لوگ

قرآن کی خدمت کی نئی نئی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔

قرآنی محفل میں واسطی صاحب نے تراویح کے اعتبار سے قرآن کو ۲۷ محافل پر تقسیم کر کے ہر حصے سے متعلق قرآن کے مطالب کا خلاصہ عام فہم انداز میں بیان کر دیا ہے۔ یہ تو یہ بڑی اچھی خدمت، مگر ایک پہلو کو اس میں خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایسے خلاصوں میں نہ تو قرآن کا جذبہ انگیز ادبی اسلوب پایا جاتا ہے۔ اور نہ وہ خاص خاص مواقع کی آیتوں کی تاثراتی جھلک کہ کہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ بجلیاں کڑک رہی ہیں، کہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے ایک طرف آگ کے الاؤ بھڑک رہے ہیں۔ اور دوسری طرف سرسبز باغ لہلہا رہے ہیں۔ کہیں یوں لگتا ہے کہ ہماری پوری شخصیت میں زلزلہ آگیا ہے۔ قرآن کے اس عُنصر سے خالی محض معلوماتی عبارات (اور وہ بھی خلاصے) بجائے اس شکل میں لانے کے مضامین کے انڈکس بنا دینے چاہییں۔ یعنی فلاں بحث فلاں آیت یا رکوع سے فلاں آیت یا رکوع تک۔ بہرحال قرآن کی تفسیر ہو یا خلاصہ، غیر ولولہ انگیز، غیر جذباتی، غیر ادبی انداز میں لانے سے قرآن کا منشا پورا نہیں ہوتا۔

برگِ گل — اقبال نمبر | بہ اہتمام: گورنمنٹ کالج سمندری - ادارت: پروفیسر محمد صدیق ظفر حجازی - پتہ: گورنمنٹ کالج سمندری ضلع فیصل آباد -

گورنمنٹ کالج سمندری کی طرف سے برگ گل کا اقبال نمبر ۴۸۳ صفحات اور بڑے رنگین سرورق کے ساتھ آیا ہے۔ اوّل درجے کے لکھنے والوں کی نگارشات اس رسالے میں جمع ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالغنی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد عبداللہ قریشی، سیّد عبدالرشید فاضل، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر محمد منور مرزا، ڈاکٹر معین الدین عقیل، پروفیسر شمیم احمد، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی —— پوری فہرست تو بہت طویل ہے۔ لکھنے والوں نے ہر طرح کے ضروری موضوعات پر مفید تحریریں پیش کی ہیں۔ مقالات کے علاوہ نظمیں بھی ہیں، مذاکرہ بھی اور پنجابی تحریروں کے لیے مخصوص صفحات بھی، لائبریریوں میں بھی رکھیے اور پڑھیے بھی۔

کامیابی کا سہرا پروفیسر محمد سلیم صدیقی پرنسپل، پروفیسر محمد صدیق ظفر حجازی (مدیر اعلیٰ) پروفیسر میاں زمان علی (نگران) کے علاوہ ان باصلاحیت نوجوان طلبہ کے سر بندھتا ہے، جنھوں نے مل کر اس مہم کو خوبی سے سر کیا۔

بتول — سیرت نمبر	ادارت: سلمیٰ یاسمین نجمی (پوسٹ بکس ۴۵۲ - راولپنڈی صدر)

دفتر رابطہ: سید پلازہ - کمرہ نمبر ۱۴ - ۳۰ فیروز پور روڈ، لاہور۔

نومبر ۱۹۸۶ء کے اس نمبر کی قیمت معلوم نہ ہو سکی۔

خواتین کے لیے دینی ترجمان طور پر جتنے بھی جرائد و رسائل نکلتے ہیں، ان میں بتول کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ مضامین مختصر مگر پختہ شائع ہوتے ہیں - اداریہ بصیرت افروز، افسانے اور نظمیں دلکش - اور اب یہ خاص نمبر ہے۔

ربیع الاول کے دور کے اکثر سیرت نمبر اپنا ایک ہی نورانی محور رکھتے ہیں - یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسوانح کی زیادہ سے زیادہ معلومات وتفصیلات نیز آپؐ کی سنت کی پھیلتی کرنیں - یہی کچھ اس خاص نمبر میں ہے - اچھے اچھے مضامین، خوش آہنگ نعتیں، نامور مضمون نگار، رسالے میں سنجیدگی کا رنگ غالب، حضورؐ کی دینی تعلیمات جابجا روح افروز۔

اُمید ہے کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

پکار — سالانہ اجتماع نمبر	بہ اہتمام اسلامی جمعیت طالبات - سربراہ ادارت: انیسہ رشید

افسوس کہ دفتر کا پتہ اس پر نہ مل سکا۔ قیمت: ۶/۵۰ روپے

یہ تحریکِ اقامتِ دین کا اعجاز ہے کہ اس نے مردوں کے علاوہ عورتوں میں اور طلبہ کے ساتھ ساتھ طالبات میں سے صفیں کی صفیں راہِ حق میں معرکہ آرائی کے لیے اُٹھا کھڑی کی ہیں۔

اسلامی انقلاب کی علمبردار خواتین نے بتول جاری کیا تو غلبۂ حق کی تمنائی طالبات نے "پکار" کا اجرا کیا۔ "پکار" کے ذریعے طالبات کی ایک بڑی تعداد نہ صرف محبتِ دین کی رُوح حاصل کرتی ہے، بلکہ ادب کے مطالعہ کے شوق میں پیش قدمی کے ساتھ ساتھ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری کی مشق کر کے مستقبل میں اپنے لیے مقام پیدا کر رہی ہیں۔

اس نمبر میں "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰن"، "مفلس کون ہے"، "آگہی"، "میرے سوال"، "خاتونِ احد"، "قرآنی نظام کا مزاج"، "دل کی تنگی"، "تنظیمی ذمہ داریاں تعلیم میں رکاوٹ نہیں بنتیں"، (کئی انٹرویوز)، "مطالعۂ سیرت"، "زندگی موت ہے کھو دیتی ہے گر ذوقِ خراش"، "باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم"، "احساس"، "کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰه" ـــ سلسلہ طویل ہے، بہت بہت اچھے مضامین ہیں، اشعار بھی ہیں، سوالات اور جوابات بھی۔

اس نمبر کو طالبات میں پھیلنا چاہیے۔

اُردو ڈائجسٹ بلوچستان نمبر	مدیر: الطاف حسن قریشی۔ دفتر: ۲۱ ر ایکڑ سکیم، سمن آباد، لاہور ۲۵ قیمت خاص نمبر -/۱۲ روپے۔ سالانہ -/۱۳۰ روپے۔

الطاف صاحب کا کمال ہے کہ مفید کام کی نئی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ جیسے شہرت یافتہ جریدہ کا اب وہ بلوچستان نمبر لائے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے معلومات جمع کیں، سفر کیے، انٹرویو لیے اور پھر جمع کردہ عجائبات کو سجا سنوار کے اس طرح کاغذی ایوان میں رکھا کہ ایک عجائب خانہ بن گیا۔

لیکن نہیں! ـــ اصل خدمت ان کی یہ ہے کہ انہوں نے بلوچستان کے خواص و عوام کے تاثرات و احساسات اور ان کے سیاسی و معاشی مسائل کو ہمارے سامنے وضاحت سے رکھ کر وہ سوالات نمایاں کیے ہیں جو بلوچستان کی سرزمین پاکستان کے اربابِ اقتدار اور اصحابِ دانش سے کر رہی ہے۔ یہ ایک قیمتی خدمت ہے جسے نہ کوئی حکومت اب

تک کر سکی اور نہ کوئی دوسرا شخص یا ادارہ! اس کے لیے مبارک باد!

باقی اُردو ڈائجسٹ کے مندرجات کی جو دلفریبیاں ہمیشہ ہوا ہی کرتی ہیں، وہ بدستور ہیں، اور اچھے اچھے لکھنے والے محفل آرا!

ہمقدم سالانہ اجتماع نمبر بہ اہتمام اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان - مدیر:- ریاض محبوب- دفتر: ۱-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور- قیمت فی شمارہ -/۵ روپے سالانہ: -/۵۰ روپے

اسلامی انقلاب کے علمبردار نوجوانوں کا یہ جریدہ پہلے سے معروف ہے۔ حال ہی میں ان کا سالانہ اجتماع ہوا تھا- اس نمبر میں اجتماع کی روئیداد اور خاص خاص تقریریں شامل ہیں۔ برادرم خرم جاہ مراد کا تفصیلی انٹرویو بہت اہم ہے- تمام سابق ناظمین کا مختصر تذکرہ بھی اس میں شامل ہے۔ درس گاہوں میں تخریبی عناصر کا مسئلہ، طلبہ کے حقوق اور یونینوں کی بحالی کا مسئلہ، "ہسٹری آف پاکستان" جیسی زہر آلود نصابی کتاب (حکومت کی تیار کردہ) کا مسئلہ، "لانگ مارچ" کی کہانی، سندھی درس گاہوں کے ناخوشگوار احوال —— اور دوسرے مندرجات —— بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں- کمال سالار صاحب کی نظم اور پروفیسر عنایت علی خاں کے قطعات خوب ہیں، مگر بعض ایسی کچی نظمیں دی گئی ہیں کہ جن کی کسی مناسب آدمی سے نظرِ ثانی بھی نہیں کرائی گئی-

ٹائیٹل زوردار ہے-

خصوصی تبصرہ

تعلیم اسلامی تناظر میں (۵)

پیش کش: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز - پتہ: مکان نمبر ۳ - ۵۶ شالیمار ایف ۴/۶ اسلام آباد - ۲۶۹ صفحے - اچھی کتابت اور رنگین ٹائٹل کے ساتھ قیمت: ۴۵/- روپے -

اسلام آباد کا یہ مشہور ادارہ (I.P.S) کئی مختلف منصوبوں پر مفید کام کر رہا ہے۔ اس ادارے نے سرکاری منصوبوں اور رپورٹوں اور بجٹوں اور پالیسیوں کے جائزے نہایت فاضل شخصیتوں کی مدد سے لے کر پبلک کے سامنے رکھے ہیں۔ آئی پی ایس نے تھوڑے سے عرصے میں متعدد دائروں میں مفید کام دکھائے ہیں، جن کی وجہ سے اسے حکومتی، سول، فوجی، صحافی اور دانشور حلقوں میں مقامِ اعتبار حاصل ہو رہا ہے۔

تعلیم کا موضوع ایک ایسا موضوع ہے جو معاشرے کا ایک دُکھتا پھوڑا بن چکا ہے جس کی درد کی ٹیسیں اہلِ احساس کے دل و دماغ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ پاکستان بناتے ہوئے قیامِ اسلام کے جو وعدے برصغیر کے کروڑوں عوام سے استوار کئے تھے، وہ چالیس سال گذرنے کے بعد بہت بڑا فراڈ ثابت ہو چکے ہیں۔ یہی فراڈ نظامِ تعلیم کے بارے میں سامنے آیا۔

آئی پی ایس نے تعلیم کو اسلامی تناظر میں پیش کرنے کے لیے مختلف موضوعات پر اربابِ تحقیق اور اصحابِ فکر کی مدد سے پانچ کتابیں مرتب کی ہیں، جن میں سے یہ آخری ہے۔ اس کا موضوع ہے "دینی مدارس میں نظامِ تعلیم"۔ یہ ایک سیمینار کا ماحصل ہے۔ ۱۶، ۱۷ دانشوروں کا جمع ہو کر ایک موضوع کے ہر پہلو پر مقالے بھی پڑھنا اور پھر مذاکرات بھی کرنا بڑا کام تھا۔ اب ان مقالات و مذاکرات کو اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں کئی خیالات اُٹھے، جن کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

ایک مسئلہ یہ کہ موجودہ نظامِ تعلیم کا جو ڈھانچہ مسجدوں سے اُٹھ کر مدرسوں تک آتا ہے، اس میں آپ پیوندکاریاں کر کے تھوڑی بہت بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس پورے ڈھانچے کو بدلنے کی کوئی تدبیر بھی ممکن ہے۔ لبطورِ خود اہلِ دین ایک نیا نظامِ تعلیم کھڑا کریں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ان مدارس میں نصابی تبدیلیاں جب بھی سوچی جاتی ہیں تو جدید علوم کے دو ایک پیریڈ بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ ایک نئے طرز کی تعلیمی وحدت سامنے رکھ کر کام کرنا ہو تو یہ طریقہ بے اثر ہے۔ نئی کتابیں لکھوایئے جو دونوں طرف کے افکار کو یکجا لائیں۔ اور اسلامی اصول و مقاصد کے تابع رکھیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ تبدیلیٔ نصاب کے لیے کیوں نہیں خاص کمیٹیاں مقرر کرتے جو نئے کورسز تجویز کریں۔ کہیں سے مؤطا اُٹھائیں، کہیں سے کتاب الخراج یا کتاب الاموال، کہیں سے مقدمہ ابن خلدون یا احکام السلطانیہ، کہیں سے مجدد الف ثانی کے مکاتیب، کہیں سے شاہ ولی اللہ کی اصول تفسیر، کہیں سے مولانا مودودیؒ کی الجہاد فی الاسلام (یا تنقیحات)، کہیں سے اقبال کے علوم اسلامی کی تشکیلِ جدید (وغیرہ)۔ اور پھر جدید علوم کی تازہ ترمعلومات کے لیے از سرِنو تیار کردہ کورس (فلسفہ، نفسیات، معاشیات، اقبالیات وغیرہ) کی ترویج۔ آخر اس کی فکر کیوں نہیں ہے۔

چوتھا یہ کہ آپ نے اس نظام سے اور تو ہر قسم کے افراد برآمد کر لیے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظامِ تعلیم کبھی تخلیقی ذہن کے بیدار دل و دانش ور نہ دے سکے گا جو تحریکِ اسلامی کے خلاف اُٹھنے والے ہر علمی چیلنج کا جواب دے سکیں۔ آج تک تو حال نزار رہی ہے۔

پھر ستم یہ کہ آج کل کے معیاری اہلِ تحقیق، مذہبی نظام مدارس تو کیا، جدید سرکاری نظامِ تعلیم بھی اس طرز کے افراد کم سے کم اسلامی صفوں کو تو بالکل نہیں دے رہا ہے۔ اگلے دن مجھ سے نائیجیریا میں پڑھانے والے ایک استاد ملے تو یہ ضرورت ظاہر کی کہ نفسیات کے متعلق ان کو رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کوئی آدمی بتایئے۔

میں نے انہیں صفائی سے یہ کہا کہ میری نظر میں ہمارے پاس کوئی ایسا ماہر علوم النفس

نہیں ہے جو تازہ نگاہی سے مغربی نفسیات کے بھی باریک رگ و ریشے کو جانتا ہو اور پھر اسلامی نقطۂ نظر سے مادہ پرستوں کے علم النفس کے مقابلے میں خدا پرستانہ علم النفس کی بنیادیں واضح کر سکے۔ یہی حال، فلسفہ، تاریخ، سیاسیات، معیشت، اجتماعیات وغیرہ علوم کا ہے۔

سالہا سال سے کام ہو رہا ہے اور اس میں جو بڑے بڑے رخنے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ مسئلہ اختلاف کو بھی آپ نے چھیڑا ہے کہ اصلاح و ترقی میں رکاوٹ ہے۔ یہ تو عین فروغِ اسلام اور نفاذِ اسلام میں رکاوٹ ہے۔ آپ اختلافات پر بھی سیمینار بلوائیے اور لوگوں سے پوچھیے کہ لڑے جھگڑے بغیر پیار اور محبت سے اختلاف کرنے کی صورتیں کیا ہیں؟ کیا تدبیر ہو کہ لوگ یہ امکان تسلیم کر لیں کہ ان کا مقابل بھی امکانی طور پر حق ہو سکتا ہے۔ یا اگر مختلف گروہوں کے لوگ جمع ہوں تو اس طرح مل جل کر وقت گذاریں کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ الگ الگ نقطہ ہائے نظر رکھنے والے لوگ ہیں۔

یہ تو ایک مصیبت ہے کہ ایک فرقہ وارانہ ذہنیت پر کسی مدرسے کی بنیاد رکھی جائے، پھر اسی ذہنیت کو طلبہ میں ٹھونسا جائے، قرآن کی تفسیر اور سنت کی تعبیر اسی ذہنیت کے مطابق کی جائے، اس کے حق میں کتب پڑھائی جائیں۔ اور مخالف کتب کے ردّ کی تعلیم دی جائے۔ نیز کوئی دوسرا مسلک رکھنے والوں کے لیے نفرت کا بیج بو دیا جائے۔ حقیقی علم اور نفرت میں یا نیکی اور نفرت میں یا خدا پرستی اور نفرت میں سخت منافات ہے۔

آج بہت سی درسگاہیں ایسی ہیں جو معاشرے کو جھگڑالو اور فتنہ آرا دینی پیشوا فراہم کر رہی ہیں۔ اور نفرتوں کی ایجنسیاں جا بجا کھلی ہیں۔

کم سے کم سارے مدارس یہ مان لیں کہ اختلافات کے باوجود محبت و اتحاد رکھ کر کام کرنے کی ایک الگ تعلیم گاہ ہو جس میں ہر فارغ التحصیل طالب علم (عالم) کم سے کم ایک سال ضرور رہے آخر آپ نے دینی اساتذہ کے لیے کوئی ٹریننگ کالج تجویز نہیں کیا؟ اس کے نقشے میں ہماری اختلاف کے علاج کی راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔

آخر میں بطور لطیفہ ہی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عربی دنیا میں اگر ”درجہ تخصص“ یا ”تخصص کر لینے“

کی اصطلاحیں رائج ہیں تو ہمارے ہاں ایسی ثقالت کی ہرگز ضرورت نہیں ۔ " درجۂ اختصاص " یا " اختصاصی درجہ " کا یا " درجۂ اختصاص کا امتحان دیا ہے ۔" یا " نفسیات میں اختصاص کیا ہے "۔ سادہ لفظ بھی کام دے سکتا ہے ۔ دو ساد اکٹھے مع شد کے آئیں اور ساتھ " خ " بھی موجود ہو تو بات شدید اور ثقیل ہو جاتی ہے ۔ اور کم خواندہ لوگوں کے ذہن کو کسی اور جانب بھی لے جاتی ہے ۔ ایسا تیشہ کسی کو پڑ گیا تو تخصص کا نام سن کر کانوں پہ ہاتھ رکھے گا ۔ یعنی کہے گا کہ میرے کان کاٹ لو مگر تخصص سے معافی دے دو ۔

باتیں بہت سی ہیں ۔ بس اس مرتبہ تو آئی پی ایس کی کتاب کا " تخصص " ہی ہو گیا ۔

رمضان المبارک کے قیمتی لمحات میں تزکیۂ نفس کا بیش قیمت نادر ہدیہ

قرآن رمضان اور محرّم

از: سید اسعد گیلانی

- قرآن نے عظیم اسلامی انقلاب برپا کیا۔
- قرآن آج بھی انقلاب برپا کرنے کی قوت و توانائی رکھتا ہے۔
- قرآن مسلمانوں کا طاقتور ترین ہتھیار ہے جس سے وہ دنیا میں سب سے بڑی سُپر پاور بن سکتے ہیں۔
- قرآن سے خوفزدگی تمام کافر حکومتوں میں موجود ہے اور وہ اس کی قوت سے خائف ہیں۔
- رمضان تزکیہ نفس اور روحانی توانائی میں اضافے کا مہینہ ہے۔
- رمضان میں ہی کفر و اسلام کا سب سے پہلا معرکہ بدر برپا ہوا تھا جس میں روزہ دار مجاہدین نے فتح پائی تھی۔
- قرآن اور رمضان مل کر مسلمانوں کو جہاد کا راستہ دکھاتے اور کامیاب کرتے ہیں۔
- محرّم آزمائشوں کا مہینہ اور مسلمانوں میں صبر و قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔
- ۳۰ کے لگ بھگ ریڈیائی تقاریر جامع اور بلیغ مبلغین اسلام کیلئے عمدہ تحفہ

ضخامت: ۱۹۲ صفحات — سائز: ۲۳ × ۱۸ / ۸ — قیمت: ۲۱ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار لاہور